کار، شلوار اور دوپٹہ

ایک پاکستانی ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر کی حیران کُن سُراغرسانی کی روئیداد



احمد یار خان

فہرست

پیش لفظ

"لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ" کے مصنف محترم صابر حسین راجپوت کی طرح محترم احمد یار خان بھی ماہنامہ "حکایت" کی دریافت ہے۔ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر احمد یار خاں کی شخصیت اور فن کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ آپ ان کی کہانیاں پڑھیں گے تو ان کی شخصیت، ان کا کردار اور ان کا فن نکھر کر آپ کے سامنے آجائے گا۔

اور یہ کہانیاں آپ پر یہ حقیقت بھی بے نقاب کریں گی کہ جرم و جاسوسی صرف انگریزی زبان میں ہی نہیں ملتی اور سراغرسانی کے کمالات صرف امریکہ اور برطانیہ میں ہی نہیں دکھائے جاتے، پاکستان میں ایسے جوہر موجود ہیں جو آپ کو نہ صرف ترجموں سے بے نیاز کر سکتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ سائنسی سہولتوں کے بغیر بھی ایسی وارداتوں کے مجرم پکڑے جا سکتے ہیں جن کا بظاہر کوئی کھرا، کھوج اور سراغ نہیں ہوتا۔ سائنسی سہولتیں تو درکنار محترم احمد یار خان کو موقعۂ واردات پر فوراً پہنچنے کے لیے اور کسی مجرم کے تعاقب کے لیے موٹر ٹرانسپورٹ بھی میسر نہیں

تھی۔ ان کی لیبارٹری اپنا دماغ اور ٹرانسپورٹ اپنی ٹانگیں تھیں۔

سراغرسانی کے علاوہ ان سچی وارداتوں میں آپ کو چار دیواری کی ڈھکی چھپی دنیا اور اپنے معاشرے کے وہ ڈرامے ملیں گے جو پڑھو تو سنسنی خیز لگتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ہر روز ہمارے سامنے، ہمارے گھروں میں کھیلے جاتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کوئی چونکتا نہیں، نہ انہیں کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ کہانیاں پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ہماری ذرا ذرا سی کوتاہیاں کتنے بھیانک المیے کا باعث بن جاتی ہیں۔ معصوم اور پاک بیٹیاں کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہیں اور جو چیونٹی کو بھی مارنے سے گھبراتے ہیں، وہ قتل تک کر گزرتے ہیں۔

میں اپنے پولیس والوں سے یہ استدعا کروں گا کہ یہ کہانیاں ضرور پڑھیں۔

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

کار، شلوار اور دوپٹہ

کار بھی غائب، شلوار بھی غائب، دوپٹہ بھی غائب۔ لڑکی کی صرف لاش ملی مگر دیہاتی علاقے میں۔ اس لاش نے ایک دیہاتی کے ہاتھوں اپنی بیوی کو قتل کرادیا۔

میں اُس وقت شہر کے ایک مضافاتی تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ ایک صبح نمبردار اور پٹواری تھانے میں آئے۔ اطلاع لائے کہ گاؤں سے چار پانچ سو گز دور ویران علاقے میں ایک لاش برآمد ہوئی ہے۔ معلوم نہیں مرد ہے یا عورت، لاش دبی ہوئی ہے۔ صرف ایک ہاتھ باہر ہے۔ ہاتھ کی ہڈیاں ننگی ہیں۔ گوشت کھایا ہوا ہے۔

میں اُسی وقت دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جس جگہ لاش دبی ہوئی تھی وہ تھانے سے ڈیڑھ میل دور تھی۔ اس جگہ سے سب سے قریب جو گاؤں تھا اس کا وہاں سے فاصلہ دو یا اڑھائی فرلانگ تھا۔ علاقہ ویران تھا۔ ایک ایک اور دو دو فٹ اونچی جھاڑیوں سے یہ علاقہ بھرا ہوا تھا۔ درخت بھی بہت تھے۔ یہ بنجر علاقہ تھا۔ کھیتیاں گاؤں کی دوسری طرف تھیں۔ اس بنجر علاقے میں پرندوں کا شکار کھیلنے کے لیے شہر سے اناڑی شکاری آیا کرتے تھے۔

میں نے لاش کا ہاتھ دیکھا جو کسی گیدڑ یا اُود بلاؤ نے مٹی سے نکال کر نُھوڑا

سا کھا لیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں لاش کے اوپر سے مٹی ہٹانے کو کہا اور میں خود علاقے میں تیز تیز قدم اٹھاتا گھومنے پھرنے لگا۔ یہ اسی قسم کا ایک قتل تھا جس کی گواہی لاش اور زمین دیا کرتی ہے لیکن یہ کام پتھر سے دودھ نکالنے کے برابر ہوتا ہے۔ میں زمین سے گواہی لینے کے لیے زمین پر نظریں گاڑے گھوم پھر رہا تھا۔ لاش سے ساٹھ ستر گز دور سے ایک پگڈنڈی گزرتی تھی۔ اس پر گیا تو زمین نے میری نظروں کو وہیں روک لیا۔

میں رک گیا اور سوچنے لگا کہ زمین جھوٹ بول رہی ہے یا سچ؟ اگر زمین سچ بول رہی ہے تو یہ لاش کسی شہری کی ہو گی دیہاتی کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ابھی لاش نہیں دیکھی تھی۔ ابھی یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مرد ہے یا عورت۔ میں نے پگڈنڈی کی خاموش زبان سن لی اور اس کی گواہی اپنی آنکھوں میں اور ذہن میں محفوظ کر لی۔

میں اپنی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ پولیس مین کی نظر عام لوگوں کی نظر سے بہت ہی مختلف اور تیز ہوتی ہے۔ بعض اوقات گھاس کا ایک تنکا جو انسانوں اور حیوانوں کے لیے صرف گھاس ہوتا ہے تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر کے لیے سونے جتنا قیمتی ہوتا ہے اور ایک آدمی کو پھانسی چڑھا سکتا ہے۔ کچھ ایسی ہی گواہی پگڈنڈی نے دی۔ میں بہت تیز قدم اٹھاتا لاش تک گیا۔ لاش ننگی کر دی گئی تھی۔ ابھی باہر نہیں نکالی گئی تھی۔ اس کے اوپر سے مٹی جھاڑ دی گئی تھی۔ گڑھا جو اس کے لیے کھودا گیا تھا مشکل سے دو فٹ گہرا تھا۔ میں نے آگے ہو کر دیکھا ——— میرے سامنے ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔

چہرہ سوجنا شروع ہو گیا تھا۔ منہ اور آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ جوان لڑکی

معلوم ہوتی تھی۔ موسم سرد تھا۔ اس لیے لاش زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ بدن پر صرف قمیض تھی جو ریشمی کپڑے کی تھی۔ شلوار نہیں تھی۔ دوپٹہ بھی نہیں تھا۔ پاؤں میں سینڈل نہیں تھے۔ سینڈل دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی بلاشک و شبہ شہری تھی۔ قمیض کا کپڑا قیمتی اور رنگ چاکلیٹ تھا۔ لاش کا رنگ لاشوں کی طرح تھا لیکن اس کی زندگی والے رنگ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ لڑکی گورے رنگ کی تھی۔ میری نظروں کے مطابق اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چھبیس سال ہوگی۔

شلوار کی غیر موجودگی سے میری یہ رائے غلط نہیں ہو سکتی تھی کہ قتل کی یہ واردات جنسی جرم ہے۔ لاش کے کانوں میں بندے نہیں، بازوؤں اور انگلیوں میں زیور کی ایک بھی چیز نہیں تھی۔ گیدڑوں وغیرہ نے ایک ہاتھ باہر نکال کر کھا لیا تھا۔ شاید اس ہاتھ کی کسی انگلی میں انگوٹھی ہو۔ یہ دایاں ہاتھ تھا۔ بایاں ہاتھ گڑھے میں تھا۔ وہاں بھی انگوٹھی نہیں تھی۔ مجھے گڑھے سے صرف ایک چیز ملی۔ یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں نے اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا۔

لڑکی قمیض کے کپڑے کے مطابق امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے جسم پر کوئی زیور نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ رہزنی کی واردات ہے۔ اس طرح یہ تین جرائم کی واردات تھی۔ اغوا یا رہزنی، آبروریزی اور قتل — یہ کام پیشہ وروں کا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے لاش باہر نکلوا کر گاؤں سے منگوائی ہوئی چارپائی پر رکھوائی۔ سر سے پاؤں تک، ہر طرف سے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ جسم پر ضرب یا زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خراش تک نہیں تھی۔ گردن کے گرد رسی یا انگلیوں کا کوئی نشان

نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ گلا نہیں گھونٹا گیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ ابھرا ہوا کوئی نشان نہیں تھا جو چوٹ کی گواہی دیتا۔ میری رائے میں لڑکی کی موت کا باعث وہ تشدد تھا جو لڑکی سے کیا گیا اور اس سے اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ اس صورت میں مجرم ایک سے زیادہ تھے۔ اتنے زیادہ کہ لڑکی زندہ نہ رہ سکی۔

میں نے تماشائیوں کو جو سب کے سب دیہاتی تھے، وہاں سے دور ہٹا دیا تھا۔ دونوں کانسٹیبلوں سے کہا کہ ہر طرف جا کر شلوار اور دوپٹہ تلاش کریں یا کوئی ایسی چیز دیکھیں جو اس لڑکی کے جسم سے اتری ہو۔ اس دوران، میں نے نمبردار اور پٹواری کے بیان قلمبند کیے، جس آدمی نے سب سے پہلے لاش کی نشاندہی کی تھی، اس کے بیان لیے اور لکھے۔ ضروری کاغذی کارروائی کی۔ انگوٹھے لگوائے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا ہوگا۔ کانسٹیبل آ گئے۔ انہیں ٹوٹی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کے تین ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ جہاں سے یہ ٹکڑے ملے، میں وہاں گیا۔ مٹی کے نشان بتاتے تھے کہ یہاں ضرور کوئی لیٹا رہا ہے۔ پاؤں کے نشان بہت تھے مگر اتنے گڈمڈ کہ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ واردات اسی جگہ ہوئی تھی۔

وہاں سے پاؤں کے جو نشان چلے وہ بھی اتنا ہی پہچانے جا سکے کہ یہاں سے کوئی گزرا ہے۔ نشان واضح نہیں تھے۔ صرف اتنا سا سراغ ملا کہ لڑکی پر تشدد کس جگہ کیا گیا ہے۔ یہ سراغ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ بس ایسے ہی تھا کہ دریا میں سے ایک قطرہ کسی پیاسے کے منہ میں ڈال دو۔ میرے اس شک کی تائید ہو گئی کہ یہ آبروریزی اور قتل کی واردات ہے۔ میں نے چوڑیوں کے تینوں ٹکڑے جیب میں ڈال لیے۔

لاش اٹھوا کر تھانے میں بھیجی۔ میں خود پیچھے رہ گیا۔ نمبردار کو خفیہ ہدایات دیں۔ مخبروں کو اپنا کام شروع کرنے کو کہا اور میں تھانے چلا گیا۔ میرے ذہن میں پگڈنڈی کی گواہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ دیہاتیوں کا کام تو آسان تھا۔ انہوں نے گڑھا مردہ اکھاڑ کر دکھا دیا تھا۔ اب مجھے زمین کی تہہ سے مجرموں کو نکالنا اور عدالت میں کھڑا کرنا تھا۔ پہلے تو میں خوش تھا کہ یہ لاش کسی دیہاتی کی ہوگی اور یہ خاندانی دشمنی کی بنا پر قتل کیا گیا ہوگا۔ ایسے قتل کے کیسوں کی سراغرسانی بہت آسان ہوتی ہے۔ مخبر فوراً پتہ چلا لیتے ہیں مگر اس کیس میں شہریوں نے اپنی ایک لاش دیہاتی علاقے میں لا کر دبا دی تھی۔ اب مجھے سمندر میں ڈوبی ہوئی چیونٹی کو ڈھونڈنا تھا۔

مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ وہ یہ تھی کہ شہر کے کسی نہ کسی تھانے میں کسی جوان لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہوگی۔ اگر لڑکی کا اتا پتا مل جائے تو مجرم کے گھر تک پہنچنا قدرے آسان ہو جائے گا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ جرائم پیشہ افراد کی فہرست مل جائے گی۔ جرائم پیشہ لوگوں سے ہم اقبال جرم کرایا کرتے تھے۔ اس فہرست میں جنسی جرائم کے پیشہ وروں کے بھی نام تھے۔

وہ کنواری نہیں تھی!

تھانے جا کر میں نے لاش کی قمیض سامنے سے پھاڑ کر اتروا لی۔ لاش سے قمیض بغیر پھاڑے نہیں اتاری جا سکتی۔۔۔۔ پھر لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوائی اور ٹیلیفون پر بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹہ صرف کر کے تمام تھانوں سے اور پولیس ہیڈکوارٹر سے

پوچھا کہ کسی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ تو نہیں آئی؟ ہر جگہ سے جواب ملا ـــ "نہیں"ـــ یہ جواب سن کر میں بڑی صبر آزما تفتیش کے لیے تیار ہو گیا۔ فوٹوگرافر کا انتظام کر کے ہسپتال بھیج دیا تاکہ لڑکی کے چہرے کی تصویر نہایت صاف لے کر پانچ چھ کاپیاں بنا دے۔ لاش کو چار یا پانچ روز ہسپتال کے سرد خانے میں رکھنے کا بھی انتظام کیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ شام تک نہ آئی تو میں ہسپتال چلا گیا۔ موت کا باعث معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک انگریز سپیشلسٹ دیکھ رہا تھا۔ بہت انتظار کے بعد رپورٹ ملی۔ لڑکی کی موت سانس رکنے سے واقع ہوئی تھی۔ گلا نہیں گھونٹا گیا تھا۔ دوسرا طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ منہ اور ناک پر ہاتھ یا کپڑا دبا کر سانس روکا گیا ہوگا۔ لڑکی کا مذہب معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ بتائی گئی۔ وہ کنواری نہیں تھی۔ یعنی شادی شدہ تھی۔ ڈاکٹروں کے معائنے کے مطابق اس نے ابھی تک ایک بھی بچے کو جنم نہیں دیا تھا۔ اسے تین روز پہلے قتل کیا گیا تھا ـــ اس رپورٹ نے میرے لیے ایک بہت پیچیدہ مشکل پیدا کر دی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت سے پہلے لڑکی پر مجرمانہ حملہ نہیں کیا گیا۔ تشدد کے کوئی آثار نہیں ملے۔ میرے سامنے جو سوال آئے وہ یہ تھے:

- اگر لڑکی پر مجرمانہ حملہ نہیں ہوا تو شلوار کہاں گئی؟
- لڑکی کے زیورات یقیناً اتارے گئے ہیں جو کسی پیشہ ور مجرم کا کام ہے۔ کیا وہ مجرم اس قدر شریف تھا کہ اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی کو اس نے بہن کا درجہ دے کر اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالا؟

○ لڑکی کو مرے تین دن ہو گئے تھے یعنی تین دن اور تین راتیں وہاں پڑی رہی مگر صرف ایک ہاتھ کھایا گیا۔ گیدڑوں یا اُودبلاؤں نے لاش کھود کیوں نہ لی؟

○ کیا یوں ہوا ہو گا کہ لڑکی کو گھر میں قتل کیا گیا اور تیسرے روز یہاں دفن کیا گیا؟

○ یہ ایک ہاتھ اوپر کس طرح اور کیوں رہا؟

○ شہر کی لڑکی اتنی دور ویرانے میں کیوں گئی؟ کیا اسے زبردستی لے جایا گیا یا قتل کر کے لے جایا گیا؟ پگڈنڈی نے خاموش سی گواہی دی تھی کہ لڑکی کو وہاں تک لے جایا گیا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ مردہ لے جایا گیا یا زندہ۔

○ کیا اسے صرف قتل کرنا مقصود تھا؟ اگر مقصد یہی تھا تو شلوار اور زیورات کہاں گئے؟

○ لڑکی تھی کون؟

لاش سرد خانے میں رکھوا دی گئی۔ فوٹو گرافر نے اسی شام مجھے لڑکی کے چہرے کے فوٹو دے دیئے جو میں نے تمام اخباروں کو اس ہدایت کے ساتھ بھجوا دیئے کہ کل صبح کے اخبار میں ضرور شائع کیے جائیں۔ صبح اخبار آئے۔ فوٹو چھپ گئے تھے۔ نیچے لکھا گیا تھا کہ اس لڑکی کے وارث ہسپتال کے سرد خانے میں لاش شناخت کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ لاش کا چہرہ کچھ پھول گیا تھا، اس لیے وارث فوٹو سے شناخت نہیں کر سکیں گے۔ دوسرے دن ریڈیو سے بھی اعلان کرایا گیا۔ لڑکی کا حلیہ بیان کیا گیا مگر وہ دن، اگلے دن اور اس سے

بھی اگلے دن کوئی نہ آیا۔ ہسپتال سے یہ اطلاع آئی کہ لاش چونکہ پہلے ہی پھولنی شروع ہو گئی تھی، اس لیے سرد خانے میں یہ زیادہ دن نہیں رکھی جا سکتی، خراب ہو رہی ہے۔ مجھے لاش وہاں سے اٹھوانی پڑی۔ مذہب کا کچھ پتہ نہ تھا۔ میں نے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرا دی۔ اس سے مجھے یہ سکون ضرور ہوا کہ لڑکی کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے یہ کیس گول ہی ہو جاتے لیکن لڑکی لاوارث تو نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اسے کسی دور دراز شہر سے نہ لایا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ یہ لڑکی طوائف ہی تو نہیں؟ میں اس لائن پر سوچنے لگا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے طوائفوں کے علاقے کے تھانیدار کو ٹیلیفون کیا۔ وہ ہر دیال سنگھ تھا۔ میرا دوست تھا۔ میں اس سے پہلے بھی پوچھ چکا تھا کہ اس کے تھانے میں کسی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ تو نہیں آئی؟ اب اس کے ساتھ پھر بات ہوئی تو اس نے پوچھا ——— "پتہ نئیں چلیا اوکدی کاکی اے؟" میں نے اسے بتایا کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کون تھی۔ ہر دیال سنگھ نے مجھے ایک "دانشمندانہ" مشورہ دیا۔ کہنے لگا۔

"احمد جارا، میری گل مَن۔ پہلاں تو ہا پتہ کر جے اوکدی کاکی اے۔ پھر تینوں پتہ چل جائے گا او کون سی گی"

میں نے اس سے پوچھا ——— "ہر دیالے، او کاکی تیری ای تے نئیں سی؟"

ہر دیال سنگھ نے مجھے نہایت دلچسپ گالی دی۔ وہ میری بات سمجھا نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ تمہارے علاقے کی طوائف تو نہیں تھی؟ وہ سمجھ گیا اور وعدہ

گیا کہ کل تک مجھے پکی خبر دے گا۔ مجھے شک تھا کہ کوئی امیرزادہ رقابت کے جوش میں لڑکی کو قتل کر گیا ہے مگر ہربال سنگھ نے دوسرے دن یہ اطلاع دے کر میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ "احمد جارا، میرا لوٹل تے پورا اے"۔ اس کے علاقے کی تمام طوائفیں جن میں اعلیٰ درجے کی بھی تھیں پوری تھیں۔ کوئی بھی لاپتہ نہیں تھی۔

اسی دن کا ڈیڑھ ایک بجا ہوگا کہ دو دیہاتی دوڑتے تھانے میں آگئے۔ انہوں نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے جیسے عید یا شادی کے موقع پر پہنے جاتے ہیں۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ ان کے گاؤں میں ایک لڑکی کی شادی ہے۔ بارات آنے والی ہے۔ لڑکی کی برادری کے کچھ لوگ بارات پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ لڑکی والوں نے انہیں رشتہ دینے سے انکار کیا تھا۔ بارات دوسرے گاؤں سے آ رہی ہے۔ اُدھر بھی اطلاع پہنچ گئی ہے کہ باراتی کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر آ رہے ہیں۔

ان دونوں کو نمبردار نے بھیجا تھا۔ یہ اسی گاؤں سے آئے تھے جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے کہ جہاں سے لاش برآمد ہوئی تھی، وہاں سے دو اڑھائی فرلانگ دور ہے۔ میں نے چھ کانسٹیبل ساتھ لیے اور نقضِ امن کے خطرے کو دبانے کے لیے فوراً روانہ ہو گیا۔ گاؤں میں گیا تو بہت سے لوگ نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یہ معمولی معمولی سے کسانوں کا گاؤں تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ ہمارے لیے اچھی قسم کی چارپائیاں باہر نکال دی گئیں۔ اوپر بستر بچھا دیے گئے۔

نمبردار موجود تھا۔

نسواری دوپٹہ اور نسواری شلوار

میں نے مطلوبہ پارٹی کے چند آدمیوں کو بلایا۔ انہیں ڈرایا دھمکایا۔ بارات دو میل دور سے آ رہی تھی۔ گاؤں کے ایک آدمی کو اُدھر یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ لوگ لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کے بغیر آئیں۔ وہاں فضا واقعی خون خرابے والی تھی۔ میں نے احتیاط کے طور پر حملے کی تیاری کرنے والی پارٹی کے تین سرغنوں کو پابند کر لیا۔ یہ سب مسلمان تھے جو لڑائی جھگڑے سے دل بہلایا کرتے تھے۔ بہر حال ضروری کارروائی جو محض زبانی تھی کر کے میں نے سب کو وہاں سے اٹھا دیا۔ سرغنوں سے کہا کہ وہ ابھی تھانے چلے جائیں اور وہاں بیٹھیں۔ تماشائی اِدھر اُدھر ہو گئے تو میں عورتوں اور بچوں کو دیکھنے لگا۔ سب نے رنگا رنگ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عورتوں کے کپڑے بہت شوخ تھے۔ بھڑکیلے اور گہرے رنگ کے کپڑے جو خاصے سستے تھے۔ اُن دنوں ٹاسا بہت چلتا تھا یا اکڑا ہوا مصنوعی ریشم جو چمک دیتا تھا۔ یہ سستا ہوتا تھا۔ دیہاتی یہی کپڑا پہنا کرتے تھے کیونکہ ان میں شو اور شوخی زیادہ اور قیمت کم ہوتی تھی۔ ایسے کپڑے یہ عورتیں عیدوں پر یا شادیوں پر پہنا کرتی تھیں۔

مجھ سے تقریباً پندرہ گز دور ایک درخت کے نیچے چھ عورتیں اور کچھ بچے کھڑے تھے۔ ان سب میں کوئی خاص بات نہیں تھی کہ میں انہیں غور سے دیکھتا۔ ان پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی تو ایک عورت نے میری نظروں کو بالکل اسی طرح جکڑ لیا جس طرح لاش برآمد ہوتے وقت پگڈنڈی نے میری نظروں

کو جکڑ لیا تھا۔ اس کا رنگ دوسری عورتوں کی نسبت صاف تھا۔ جسم بہت اچھا تھا۔ باقی عورتوں نے بال اس طرح گوندھ رکھے تھے کہ کوئی بال دوپٹے سے باہر نہیں تھا لیکن اس عورت نے کنپٹیوں سے کچھ بال کانوں سے آگے کو کھلے چھوڑ رکھے تھے جو اچھے لگتے تھے۔ وہ جوان بھی تھی۔ وہ شوخ بھی نظر آتی تھی مگر میں نے اسے غور سے اس وجہ سے نہیں دیکھا کہ دوسریوں کی نسبت اس میں کشش تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی شلوار اکڑے ہوئے ٹاسے کی نہیں تھی بلکہ قیمتی کپڑے کی تھی اور اس کا دوپٹہ بھی قیمتی تھا۔ البتہ اس کی قمیض دیہاتی ذوق کے عین مطابق تھی۔ یہ لوگ شوخ رنگ پسند کیا کرتے تھے۔ مثلاً گہرا سرخ، گہرا سبز اور جامنی وغیرہ۔ اس عورت کی قمیض تو ویسی ہی تھی لیکن شلوار اور دوپٹے کا رنگ دیہاتی ذوق سے بہت دور تھا۔ رنگ کے علاوہ شلوار کے کپڑے کی ڈھلک بتاتی تھی کہ یہ عورت کھاتے پیتے گھرانے کی ہے اور اس کا ذوق شہری ہے مگر قمیض بھانڈہ پھوڑ رہی تھی۔

اچانک شلوار اور دوپٹے کے رنگ نے میرے ذہن میں ہلچل مچا دی ـــــ رنگ چاکلیٹ تھا ـــــ میری نظروں کے سامنے لاش کی قمیض آ گئی۔ قمیض پر ہلکے ہلکے اور ایک دوسرے سے دور دور پھول تھے اور اس کی زمین چاکلیٹ رنگ کی تھی۔ مجھے شلوار اور دوپٹے کی تلاش تھی۔ دونوں چیزیں میرے سامنے تھیں۔ میں اٹھا اور آہستہ آہستہ اس انداز سے ٹہلتا ان عورتوں کی طرف جانے لگا، جیسے میں انہیں نہیں دیکھ رہا۔ حوالدار سگن ناتھ میرے ساتھ تھا۔ میں اس کے ساتھ غیر متعلق سی باتیں کرتا رہا۔ عورتیں ذرا ایک طرف ہو گئیں۔

میں نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا ـــــ "شادی مبارک ہو بہنو! فکر نہ کرو

اب دنگا فساد نہیں ہوگا"۔۔۔۔ میں نے اس عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے کانٹے تھے جو صرف شہری لڑکیاں استعمال کیا کرتی تھیں۔ دیہات کی عورتیں کانوں میں اتنے لمبے لمبے کانٹے ڈالا کرتی تھیں، جو کندھوں پر پڑتے تھے اور یہ چاندی کے ہوتے تھے مگر اس عورت کے کانٹے نفیس ذوق کا پتہ دیتے تھے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس عورت کا ذوق اتنا نفیس ہو۔ اس عورت نے مجھے مزید شک میں اس طرح ڈالا کہ میں جب ان عورتوں کے قریب گیا تو وہ پیچھے ہٹ کر دوسری عورتوں کے پیچھے چھپ گئی اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

میں ایک طرف کو ٹہلتا گیا۔ جگن ناتھ کے علاوہ نمبردار بھی میرے ساتھ تھا اور چند آدمی میرے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ میں نے نمبردار کو الگ لے جا کر اس سے پوچھا۔۔۔۔ "نسواری دوپٹے اور شلوار والی عورت کون ہے اور کیسی ہے؟" اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ میں نے اسے حلیہ بتایا تو وہ مسکرایا۔ وہ شاید میرے کردار سے ابھی واقف نہیں ہوا تھا۔ راز داری سے بولا۔۔۔۔ "دانہ ہے حضور، آپ حکم کریں۔"

میں جانتا تھا کہ نمبردار تھانیداروں کو کیسے کیسے طریقوں سے خوش کیا کرتے ہیں۔ میں نے اسے بالکل نہیں کہا کہ یہ دانہ مجھے چاہیے یا یہ کہ میں بڑا شریف آدمی ہوں۔ وہ تھانیدار کمزور سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ وہ شریف آدمی ہے۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں کو پکڑنے اور انہیں جرم کرانے کے لیے شرافت نقصان دیتی ہے۔ تھانیدار شریف بھی ہوتے ہیں لیکن زبان کے گندے ہوتے ہیں

جو نہایت ضروری ہوتا ہے۔ میں نے مسکرا کر نمبردار سے پوچھا۔ "یہ دانہ کس کا ہے؟"

"نکاح تو اس کا بکّو سے ہوا ہے لیکن ہے اڑتا پنچھی"۔ نمبردار نے جواب دیا۔ "اس عورت کا نام آمنہ بی بی ہے۔ لوگ اسے امّو پکارتے ہیں۔ تین سال پہلے اس کی شادی اس گاؤں میں ہوئی تھی جہاں سے آج بارات آرہی ہے۔ ایک سال بعد اسے بدچلنی کے شبہے میں طلاق مل گئی تھی۔ ایک سال گھر بیٹھی رہی۔ پھر بکّو نے اس کے ساتھ شادی کرلی۔ ایک سال ہو گیا ہے۔ لڑکی شوباز ہے۔ آنکھوں سے باتیں کرتی ہے۔ شکاری عورت ہے"۔

اس کے خاوند بکّو کے متعلق نمبردار نے بتایا۔ "وہ آدمی ٹھیک نہیں۔ کھیتی باڑی کرتا ہے اور واردات کرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ جوا بھی کھیل لیتا ہے۔ لٹھ باز ہے۔ چاقو چلا لیتا ہے۔ اس کا ریکارڈ صاف ہے۔ آپ کے اس تھانے میں آنے سے پہلے تین دفعہ مشتبہ بٹھایا گیا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ نکل آیا۔ یہ ضرور ہے کہ پیشہ چوری چکاری اور جوا نہیں ہے۔ آدمی استاد ہے۔ مگر اب بیوی نے اسے دبا لیا ہے۔ اس میں پہلے والی شرارت اور شوخی نہیں رہی اب تو سر بھی اونچا نہیں کرتا"۔

نمبردار نے بکّو اور امّو کی تین چار کہانیاں سنائیں اور ثابت کیا کہ دونوں شریف نہیں ہیں۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ میرا مسئلہ حل ہونے کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ امّو کی شلوار اور دوپٹہ اور کانٹے بتا رہے تھے کہ یہ مقتولہ کے جسم سے اترے ہیں۔ قمیض اتارنی مشکل تھی، اس لیے نہیں اتاری گئی لیکن سوال یہ تھا

کہ شہری لڑکی اتنی دور کس طرح آئی؟ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ یہ دیہاتی آدمی اسے شہر سے ورغلا لایا ہو۔ صرف ایک صورت سمجھ میں آتی تھی کہ بکّو شہر کے جرائم پیشہ گروہ کا آدمی ہے۔ بہر حال جو کچھ تھا، اسی گاؤں میں یا بکّو کے گھر میں تھا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ مجھے بکّو کے گھر لے چلو۔

وہ دوپٹہ اور شلوار بدل آئی

بکّو کے گھر کے سامنے میں نے نمبردار اور حوالدار جگن ناتھ کو باہر کھڑا رہنے کو کہا اور اکیلا اندر چلا گیا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی تو بکّو اندر سے نکلا۔ دوڑ کر میرے گھٹنے چھوئے اور ہاتھ ملایا۔ دوڑ کر چارپائی اٹھا لایا۔ میں نے پوچھا۔

"امّو کہاں ہے؟"

اس نے کہا۔ "اندر ہے۔"

میں نے کہا۔ "باہر بلاؤ۔"

"کیوں سرکار؟" بکّو نے غلاموں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم غریبوں سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہے؟ ہم تو بڑے غریب لوگ ہیں سرکار۔"

"کچھ نہیں ہوا بکّو۔" میں نے دوستوں کی طرح پیار سے کہا۔ "تم ڈر کیوں رہے ہو؟ تم سے اور تمہاری بیوی سے دو تین باتیں پوچھنی ہیں پھر چلا جاؤں گا۔ گھبراتے کیوں ہو؟"

"چلے کیوں جائیں گے سرکار۔" اس نے میرے گھٹنے چھو کر کہا۔ "ہم سر مدں پر بٹھائیں گے۔"

"امّو کو بلاؤ۔" میں نے پھر کہا۔

"بلاتا ہوں سرکار۔ آپ کی باندی ہے۔ سرکار کے قدموں میں بیٹھے گی"۔۔۔ وہ امّو کو بلانے کی بجائے بولتا ہی جا رہا تھا۔ اس سے مجھے شک ہوا جیسے وہ اسے بلانے میں دانستہ دیر کر رہا ہے۔ میں نے آواز دی۔ "امّو! باہر آؤ"۔۔۔ بکّو اٹھ کر اندر کو دوڑا۔ پھر بھی انہوں نے باہر آتے کچھ وقت لگایا۔ میں نے امّو کو دیکھا۔ اب اس کا دوپٹہ چاکلیٹ رنگ کا نہیں تھا اور نہ ہی شلوار چاکلیٹ تھی۔ کانوں میں چھوٹے بُندوں کی بجائے چاندی کے بڑے بڑے کانٹے تھے۔ اس کی شلوار قمیض کے ساتھ کی تھی اور دوپٹہ دیسی ریشم کا جسے ذرا سا کھینچو تو تار تار ہو جائے۔ یہ تھی اصلی دیہاتی پسند۔

وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور بکّو سے کہا کہ وہ دور کھُرلی کی دوسری جانب جا کر کھڑا ہو جائے۔ امّو میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی کلائیاں دیکھیں اور دھیمی آواز میں کہا۔۔۔ "یہ چوڑیاں کیوں نہیں اتاریں؟"۔۔۔ وہ گھبرا تو گئی لیکن عورت تیز تھی کہنے لگی۔

"یہ چوڑیاں۔۔۔ یہ میں نے شہر سے خریدی تھیں۔"

ان چوڑیوں کے چار ٹکڑے میرے پاس موجود تھے جو میں نے تھانے میں اپنی میز کی دراز میں رکھ دیئے تھے۔ ایک ٹکڑا مجھے لاش والے گڑھے سے ملا تھا۔ اور تین ٹکڑے کانسٹیبلوں کو گڑھے سے دور سے ملے تھے جب میں نے انہیں کہا تھا کہ شلوار اور دوپٹہ تلاش کرو اور جو چوڑیاں ٹوٹی نہیں تھیں وہ امّو کی کلائیوں میں تھیں۔ یہ کانچ کی باریک باریک اور عمدہ قسم کی چوڑیاں تھیں اور رنگ نہایت

دل کش تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ چوڑیاں لاش کے بازوؤں سے اتاری گئی تھیں۔ میں نے امّو سے پوچھا۔۔۔ "نسواری دوپٹہ اور شلوار کیوں اتار دی ہے؟ وہ تمہیں بہت اچھی لگتی تھی"۔

اس نے فوراً جواب دیا۔۔۔ "لوگ جلتے ہیں۔ یہ شلوار اور دوپٹہ مجھے خاوند نے شہر سے لا دیا تھا۔ شلوار شہر کے درزی سے سلوائی تھی"۔

"کب؟"

"چھ مہینے شاید ہو گئے ہیں"۔

مجھے زیادہ سوال جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے امّو سے کہا کہ وہ اندر چلی جائے۔ وہ چلی گئی تو میں نے بکّو کو بلایا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔ میں نے اس سے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لیے کہا۔

"تمہاری بیوی ہے تو بہت چالاک لیکن بات چھپا نہیں سکی۔ میں نے جو پوچھا، اس نے صاف بتا دیا"۔

ہمارے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ مشتبہ ہمارے سوال کا جواب دے تو ہم جواب پر ہی غور کریں اور اگلا سوال پیدا کریں۔ بعض سوال کر کے مشتبہ یا ملزم کے الفاظ نہیں سنے جاتے بلکہ اس کے چہرے کو دیکھا جاتا ہے کہ اس پر کیا رنگ آتا اور جاتا ہے۔ چہرے کا رنگ جو بدلتا ہے وہ ہمارے سوال کا صحیح جواب ہوتا ہے۔۔۔ میں نے بکّو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا جس کی تبدیلی نظر نہیں آسکتی تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں نے جو حرکت کی اس سے مجھے جواب مل گیا۔

اس نے بے چینی سے میری طرف دیکھا اور پھر بےکلفت بولا۔۔۔ "سرکار، ایسی

کون سی بات ہے جو بیوی نے بتا دی ہے؟ ہم نے کیا کیا ہے سرکار؟"

"قتل۔"

وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ بولا۔" قتل؟ ... کس کا قتل سرکار؟ ہم سرکار کے غلام، حکم کے بغیر مکھی بھی نہیں مارتے۔"

"سنو بکو"۔ میں نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا ۔" دو روز بعد جو اقبالِ جرم کرو گے وہ آج ہی کیوں نہیں کر دیتے۔ مال تمہارے گھر سے ابھی برآمد ہو گا۔ لاش برآمد ہو چکی ہے۔ دوستوں کی طرح مان جاؤ۔ تم ضرور تھانے چل کر میرے ہاتھ سے الٹا لٹکو گے اور مرچوں کی دھونی لو گے؟ یاد رکھو جب تک بکو گے نہیں تم چھت سے لٹکتے رہو گے اور نیچے میں آگ میں مرچیں پھینکتا رہوں گا۔" ۔۔۔ میں اسے دھمکی دے رہا تھا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے تھرڈ ڈگری کا طریقہ کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔

اس نے ہاتھ جوڑ کر اور روہانسی آواز میں کہا ۔۔۔ "سرکار، قرآن پر ہاتھ رکھا لو۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میرے اندر کوئی مال نہیں۔"

"غور سے سنو بکو"۔ میں نے کہا۔" تم قرآن پر ہاتھ نہ رکھو۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر تمہارے ساتھ وعدہ کروں گا کہ تمہیں اس کیس میں سے اس طرح نکال لوں گا جس طرح مکھن سے بال نکالتے ہیں۔ تم اپنے ساتھی پکڑا دو۔ میں تمہیں سلطانی گواہ بنا دوں گا۔ بس گواہی دے کر گھر آجاؤ گے۔ ورنہ پھانسی چڑھو گے۔"

اس کا سارا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے اسے دورہ پڑ گیا ہو۔ میں نے اسے سہارا دینے کے لیے پھر کہا کہ اس کے بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ وہ سلطانی گواہ بن جائے مگر اس کا جسم کانپتا رہا اور بات کرنے لگا تو اس کی زبان بھی کانپ

رہی تھی۔ میں نے جگن ناتھ اور نمبردار کو اندر بلایا۔ نمبردار سے کہا کہ وہ کسی بزرگ کو ساتھ لے آئے اور جگن ناتھ سے کہا کہ وہ دو کانسٹیبل گاؤں میں رہنے دے اور باقی کو اپنے ساتھ تھانے لے جائے اور گاؤں کے ان تین آدمیوں کو جنہیں میں نے تھانے بھیج دیا تھا، میرے آنے تک وہیں بٹھائے رکھے۔

نمبردار ایک بزرگ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ میں بکّو کو اندر کمرے میں لے گیا۔ امّو چارپائی پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نمبردار اور بوڑھا ابھی باہر تھے۔ بکّو نے میرا بازو پکڑ لیا اور بہت آہستہ سے بولا ——" انہیں باہر نکال دیں سرکار۔ پہلے میری بات سن لیں۔ اللہ پاک کی قسم کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔"

قاتل گئے رہزن آئے

میں نے اسے موقعہ دینے کے لیے ان دونوں کو باہر نکال دیا۔ بکّو اپنی بیوی کے سامنے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے امّو کو باہر بھیج دیا۔ میں چارپائی پر اور بکّو فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے جو لمبا چوڑا بیان دیا، وہ مختصراً اس طرح ہے کہ چھ سات روز پہلے کا ذکر ہے۔ بکّو آدھی رات سے پہلے ایک گاؤں سے اپنے گاؤں کی طرف آرہا تھا چاندنی رات تھی۔ گاؤں سے دو فرلانگ دور اسے ایک عورت کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کا جسم ابھی تک گرم تھا اور ابھی اکڑا ابھی نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس جگہ سے ابھی بہت دور تھا کہ اس ویرانے میں اسے ایک موٹر کی آواز سنائی دی تھی۔ کوئی بتی نظر نہیں آئی تھی۔ بکّو سوچتا رہا کہ اس طرف موٹر کا کیا کام؟ پھر آواز بند ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد موٹر کی آواز پھر سنائی دی اور یہ آواز دور جاتے جاتے ختم ہوگئی۔

بکوّ آگے آتار ہا اور اسے لاش نظر آئی۔

یہاں تک بکو کا بیان میرے لیے قابلِ قبول تھا۔ وہاں تک ایک کار ضرور آئی تھی۔ پگڈنڈی نے مجھے بھی گواہی دی تھی۔ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ جب دیہاتی لاش سے مٹی ہٹا رہے تھے تو میں ارد گرد کے علاقے میں گھومتا ہوا پگڈنڈی تک چلا گیا تھا اور وہاں میری نظریں پگڈنڈی پر جم گئی تھیں۔ مجھے وہاں کار کے ٹائروں کے نشان نظر آئے تھے۔ ایک نشان اور بھی تھا جو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا ہوا تھا۔ نمبردار اور گاؤں کے تین آدمیوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ تین چار دن گزرے رات کے وقت انہوں نے اس علاقے میں موٹر گاڑی کی آواز سنی تھی۔ بتی نظر نہیں آئی تھی۔ بکو کا یہ بیان بھی میرے لیے قابلِ قبول تھا کہ لاش ابھی گرم تھی اور اکڑی بھی نہیں تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی کو تھوڑی دیر پہلے قتل کیا گیا تھا۔ کار میں اس کا سانس روکا گیا یا باہر لا کر روکا گیا اور لاش وہیں پھینک کر کار چلی گئی۔ اب یہ سوال تھا کہ شلوار، دوپٹہ اور زیور بکوّ کی بیوی تک کس طرح پہنچے ___ بکوّ نے بتایا کہ وہ لاش کی اطلاع نمبردار کو دے کر یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا کہ اس پر شک کیا جائے یا وہ گواہ کی حیثیت سے پیشیاں بھگتتا رہے۔ چاندنی میں اسے لڑکی کے کانوں کے بندے چمکتے نظر آئے۔ جیسا کہ نمبردار نے مجھے بتایا تھا کہ بکوّ شریف آدمی نہیں ہے اور واردات کرنے سے بھی نہیں گھبراتا، میں بکو کا یہ بیان سن کر حیران نہ ہوا کہ اس نے لاش کے کانوں سے دونوں بندے اتار لیے۔ گلے میں سونے کی زنجیر اور اس کے ساتھ سونے کا پتا تھا جس کا سائز ایک روپے کے سکے جتنا تھا۔ ایک انگوٹھی دائیں

ہاتھ کی درمیانی انگلی میں تھی اور ایک بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ والی انگلی میں۔ بکّو نے یہ تمام چیزیں اتاریں اور بہت تیز چلتا گھر چلا گیا۔

اس کی بیوی جاگ اٹھی۔ بکّو نے دیا جلایا اور زیورات بیوی کے ہاتھ میں دے دیئے۔ بیوی کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بکّو سے پوچھا کہ یہ چیزیں وہ کہاں سے لایا ہے۔ اس نے بتا دیا کہ ایک لاش سے اتار لایا ہوں۔ یہ سن کر امتو گھبرائی۔ ایک تو اتنے سارے زیور نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ دوسرے لاش کا سنا تو دماغ زیادہ خراب ہو گیا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اجڈ دیہاتی تھے اس لیے کوئی بہتر ترکیب نہ سوچ سکے امتو نے بکّو کو مشورہ دیا کہ لاش کو کہیں دبا دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل صبح جب لاش کی رپورٹ پولیس کو ملے تو پولیس تمہارے کھرے پر ہمارے گھر پہنچ جائے۔ وہاں لاش نہ ہوئی تو کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہاں کوئی قتل ہوا ہے اور اس کا زیور ہمارے پاس ہے۔

بکّو کو یہ بات پسند آ گئی۔ اس نے امتو سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے تاکہ کام جلدی ختم ہو جائے۔ انہوں نے زیورات ٹرنک میں رکھ دیئے۔ کدال اٹھائی اور گاؤں سے نکل گئے۔ گاؤں کے لوگ بیہوشی کی نیند سویا کرتے ہیں۔ سردیوں کی راتیں تھیں۔ سب لوگ اندر سوئے ہوئے تھے۔ باقی علاقہ ویران تھا۔ پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دونوں لاش تک پہنچے۔ ابھی لاش کو کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں آئی تھی۔ بکّو نے ایک ایسی جگہ جہاں تھوڑی سی جھاڑیوں کے درمیان جگہ خالی تھی گڑھا کھودا۔ اس دوران امتو لاش کو دیکھنے چلی گئی تھی اور اس نے کلائی کی چوڑیاں بھی اتار لی تھیں۔

دونوں نے لاش اٹھائی۔ بکو نے سینڈل دیکھے تو وہ بھی اٹھا لیے۔ لاش گڑھے میں رکھ کر اس نے سینڈل لاش کی ٹانگوں کے درمیان رکھ دیئے۔ امو سینڈل بھی اٹھانے لگی تو بکو نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ شہر کے فیشن کے ہیں گاؤں میں شک پیدا کریں گے۔ ان بدبختوں نے یہ نہ سوچا کہ زیورات اور کپڑے بھی شہر کے ہی فیشن کے تھے۔ بکو نے بتایا کہ لاش گڑھے میں رکھتے اس کا دایاں بازو معلوم نہیں کس طرح اوپر کو اٹھ گیا تھا جو اس نے لاش کے پہلو کے ساتھ لگا دینے کی بجائے گڑھے کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اوپر مٹی ڈال دی۔ غالباً دائیں ہاتھ کی انگلی ذرا باہر رہ گئی تھی جو کسی جیز نے سونگھ کر ہاتھ باہر گھسیٹ کر کھا لیا۔ وہاں بھیڑیئے نہیں تھے ورنہ لاش باہر نکال لیتے۔

ضروری نہیں تھا کہ میں بکو کے سارے ہی بیان کو سچ مان لیتا۔ میں نے اس سے اس کی مجرمانہ عادتوں کے متعلق بہت سے سوال پوچھے پھر اسے کہا کہ لاش کو چھپانا اور اس سے چیزیں اتارنا سخت جرم ہے اور مذہب کے لحاظ سے بھی گناہ ہے۔ اس کے آنسو نکل آئے۔ اس نے کہا کہ یہ جرم اس سے اس کی بیوی نے کرایا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کے چال چلن کے متعلق بتایا کہ بڑی "شوقین" عورت ہے۔ اسے اچھے کپڑوں اور زیورات کا بہت شوق ہے۔ اس کی طبیعت میں عیاشی ہے۔ پہلے خاوند سے اسی وجہ سے طلاق ملی تھی۔ یہ کم بخت اُس وقت کی "یاریاں" ابھی تک نبھا رہی ہے۔

بکو اپنی بے عزتی کے ڈر سے اسے طلاق نہیں دیتا تھا بلکہ منتیں کرتا رہتا تھا کہ وہ باز آجائے۔ اسے خوش کرنے کے لیے اس نے جوا کھیلنا بھی شروع کر دیا

تھا تاکہ پیسے زیادہ کما کر اس کی کپڑوں وغیرہ کی فرمائشیں پوری کر سکے۔ وہ اب اس سے تنگ آچکا تھا۔ کئی روز سے وہ اسے سونے کے کانٹے لانے کو کہہ رہی تھی اور وہ پریشان تھا کہ اتنے پیسے کہاں سے لائے۔ اُس رات وہ ایک گاؤں میں جُوا کھیلنے گیا تھا۔ اسی لیے اتنی دیر بعد گاؤں واپس آیا تھا۔ راستے میں اسے لاش ملی، جس کے ساتھ زیورات بھی تھے۔ بکّو کے دماغ میں یہی خیال چھایا ہوا تھا کہ امّو کی فرمائش پوری کرنی ہے ورنہ وہ اسی لالچ میں کسی اور کے ساتھ تعلقات قائم کرلے گی۔ خدا نے بکّو کو موقع دیا اور اس نے یہ سوچے بغیر کہ یہ جرم ہے یا خدا کی نظر میں گناہ ہے لاش کا زیور اتار لیا اور جب امّو وہاں گئی تو لاش کے کپڑے بھی اتار لائی۔

میں نے باہر جا کر نمبردار سے کہا کہ امّو کے پہلے خاوند کو اس کے گاؤں سے بلوا لے اور اسے اس گاؤں کا نام بھی بتایا جہاں بکّو کہتا تھا کہ جُوا کھیلنے گیا تھا۔ بکّو سے نام پوچھ کر چار آدمیوں کو بلوانے کے لیے کہا۔ نمبردار اسی وقت چلا گیا۔ میں نے گاؤں کے بزرگ کو فارغ کر دیا۔ بکّو کو کمرے سے نکال کر اس کی بیوی کو اندر بلایا۔ بکّو نے فوراً بولنا شروع کر دیا تھا۔ مگر امّو نے مجھے چکر دینے [illegible] کر دیے۔ نمبردار نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ شکاری عورت ہے۔ میں اس کی وہ حرکتیں اور باتیں نہیں لکھ سکتا جو اس نے میری مردانگی کو گمراہ کرنے کے لیے کیں۔ میں اس سے کچھ اور پوچھتا اور وہ کوئی اور ہی بات چھیڑ دیتی۔ اس طرح کچھ دیر زبانوں کی آنکھ مچولی چلتی رہی۔ اس کو یہ غلط فہمی تھی کہ بکّو نے شاید مجھے کچھ نہیں بتایا۔

میں نے اس کی چوڑیوں والی کلائی پکڑ کر پوچھا ــــ "چوڑیاں لاش سے

اتار تے دو لوٹی تھیں یا زیادہ؟
اس نے جواب دینے کی بجائے یہ حرکت کی کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ رکھی تھی۔ اس نے اسی ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لی اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر پھیرنے لگی۔ اس وقت تک میں بھولا بنا رہا تھا۔ میں صرف یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ یہ عورت کیسے چال چلن کی ہے۔ وہ مجھے یقین ہو گیا۔

میں نے یکایک رویّہ بدل لیا اور کہا ——— "تم اور تمہارا خاوند سیدھے پھانسی کے تختے پر جا رہے ہو۔ تمہارے خاوند نے اس لڑکی کو قتل کیا اور دونوں نے مل کر اس کے زیورات اور کپڑے اتارے۔ کہو کیا کہتی ہو؟ تم جاہل دیہاتن مجھے چکر دے لو گی؟" ——— وہ بدک گئی۔ میں نے بڑے اطمینان سے کہا ——— "وہ سارے آدمی تمہارے خلاف گواہی دیں گے جن کے ساتھ تمہارے تعلقات ہیں۔"

چوڑیاں بھی اتار دیں

اس نے آخر بولنا شروع کر دیا اور ہو بہو وہی کہا جو بکّو مجھے سنا چکا تھا۔ ذرّہ بھر فرق نہیں تھا۔ اپنے چال چلن کے متعلق بھی اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ میں نے بکّو کو اندر بلا لیا اور دونوں سے کہا کہ خود ہی ساری چیزیں نکال دو۔ دونوں نے کوئی حیل وحجت نہیں کی۔ ٹرنک سے تمام چیزیں نکال دیں۔ اسّو نے شلوار اور دوپٹہ شادی کے لیے پہنا تھا۔ کانوں میں مقتولہ کے جُھمکے اور انگلیوں میں انگوٹھیاں ڈالی تھیں مگر گاؤں میں پولیس کو دیکھ کر اسے ذرا دیر بعد خیال آیا کہ یہ چیزیں پہچانی نہ جائیں۔ وہ وہاں سے کھسک گئی مگر میں سب کچھ دیکھ چکا

تھا۔ میں جب اس کے گھر میں داخل ہوا تھا تو وہ اندر کپڑے بدل رہی تھی اور یہ چیزیں چھپا رہی تھی۔ اسی لیے بکو اسے اندر سے بلانے میں دیر لگا رہا تھا۔ اب انہوں نے چیزیں ٹرنک سے نکال دیں۔ امّو نے شلوار اور دوپٹہ ایک گھڑے سے نکالا جو کمرے کے کونے میں رکھا تھا اور اس پر دو اور گھڑے رکھے تھے۔ یہ کورے گھڑے تھے جن پر رنگ برنگے پھول بنائے ہوئے تھے۔

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ تفتیش جاری رکھوں گا خواہ راتیں اسی گاؤں میں گزارنی پڑیں۔ اُن دنوں جرائم کی یہ بھرمار نہیں ہوتی تھی، جو آج پاکستان میں ہے۔ چھوٹے موٹے جرائم ہوتے تھے۔ ایسے پیچیدہ کیس کوئی ایسے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ میرے پاس کچھ وارداتیں تھیں۔ میں نے ان کی تفتیش ملتوی کر دی اور بکو اور اس کی بیوی کے بیان کی تصدیق یا تردید ہونے تک گاؤں میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ لاش کے زیورات اور کپڑے میرے سامنے رکھ دیئے گئے۔ امّو نے چوڑیاں بھی اُتار دیں۔ میں سوچنے لگا کہ ان دونوں کو حراست میں لوں یا ابھی شاملِ تفتیش ہی رہنے دوں۔ اتنے میں باہر ڈھولوں کی آوازیں آنے لگیں اور گولے پھٹنے لگے۔ بارات آ گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد نمبردار نے اندر آ کر اطلاع دی کہ امّو کا پہلا خاوند آ گیا ہے۔ اس کے اتنی جلدی آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسی بارات کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے اسے اس کی چھوڑی ہوئی بیوی کے گھر بلانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ اسے کمرے کے دروازے میں کھڑا کیا۔ بکو اور امّو کو صحن میں بیٹھنے کو کہا اور میں باہر چلا گیا۔

امّو کے پہلے خاوند سے میں نے امّو کے چال چلن کے متعلق پوچھا۔ اس نے

بتایا کہ بدکار اور عیاش عورت ہے۔ اسے امیرزادی بننے کا شوق ہے ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ چوری چکاری بھی کرتی ہے؟ اس نے جواب دیا ۔۔۔ "اسے ذرا سا لالچ مل جائے تو سب کچھ کر گزرتی ہے"۔۔۔ میں نے چند اور باتیں پوچھیں لیکن یہ میری تفتیش کے لیے کوئی خاص فائدہ مند نہیں تھیں۔

دن کے پچھلے پہر اس گاؤں کے چار آدمی آ گئے جہاں سے بکّو رات کو واپس آ رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ بکّو ان کے گاؤں میں سورج غروب ہو رہا تھا تو گیا تھا اور آدھی رات سے بہت پہلے وہاں سے چلا تھا۔ وہ جوا کھیلتے رہے تھے۔ میں نے ان چاروں کو پابند کر لیا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ کہیں یہ واردات ان چاروں کی تو نہیں؟ اس کے ساتھ ہی میں نے بکّو سے کہا کہ اپنا اور اپنی بیوی کا کوئی ضمانتی بلا لو۔ میں دراصل انہیں ابھی گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا تجربہ، میری سوجھ بوجھ اور اس میاں بیوی کے بیان یقین دلا رہے تھے کہ قاتل کوئی اور ہے۔ میں نے نمبردار کو بلا کر کہا کہ وہ ان دونوں کا ذمہ دار ہے۔ جس وقت ان کی مجھے ضرورت ہو انہیں فوراً حاضر کیا جائے۔ ان سے جو چیزیں برآمد ہوئی تھیں، ان کا میں نے مشیر نامہ بھی نہ بنایا حالانکہ انہوں نے ایک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

میں نے ان چاروں کو جن کے گاؤں میں بکّو جوا کھیلنے گیا تھا اور بکّو کو بھی ساتھ لیا اور سب کو تھانے لے گیا۔ انہیں برآمدے میں بٹھا کر میں نے وردی اتاری، نہایا اور بڑے آرام سے لیٹ کر سوچنے لگا۔ میرے سامنے یہ حقائق آئے۔

○ زیورات لاش کے ساتھ تھے۔ لہٰذا یہ رہزنی کی واردات نہیں۔

○ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق یہ آبروریزی کی واردات نہیں۔

○ کار وہاں تک گئی تھی اور واپس آئی تھی۔ لہٰذا لاش یا مقتولہ زندہ وہاں تک شہر سے لے جائی گئی۔

○ بکو اور اس کی بیوی کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

○ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کا جو دن اور وقت مقرر کیا گیا تھا، اس دن اور اس وقت بکو دوسرے گاؤں میں تھا۔

○ اگر قاتل بکو جیسے دیہاتی ہوتے تو کلہاڑی استعمال کرتے یا گلہ گھونٹ دیتے۔ سانس روک کر قتل کرنا انگریز ملکوں کا طریقۂ قتل ہے اور یہ طریقہ ذہین قاتلوں کا ہے۔

اس ویرانے میں کار کے جانے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی امیر زادہ کسی لڑکی کو کار میں بٹھا کر عیاشی کے لیے وہاں لے گیا۔ اس صورت میں اگر بکو جیسے رہزن حملہ کرتے تو وہاں ایک یا دو آدمیوں کی بھی لاشیں ہونی چاہئیں تھیں یا صرف ایک آدمی کی لاش ہوتی اور لڑکی غائب ہوتی۔

عجیب بات تو یہ تھی کہ لڑکی کو قتل ہوئے ساتواں روز تھا اور ابھی تک شہر کے کسی تھانے میں کسی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی۔ اس سے شک ہوتا تھا کہ لڑکی کسی اور شہر سے لائی گئی ہے۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پولیس ہیڈکوارٹر کو لکھوں گا کہ وہ ضلعے کے بڑے بڑے شہروں میں محکمے کو اطلاع دیں اور لڑکی کے فوٹو بھی بھیجیں۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے ان چار آدمیوں کو اور بکو کو بھی اکٹھا بٹھا کر بہت کچھ کہا اور پوچھا اور انہیں یہ حکم دیا کہ روزانہ صبح سورج نکلتے وقت تھانے میں آجایا کریں۔ میں نے بکو کو الگ کر کے کہا۔ ”ابھی تم نے لاش کے کپڑے اتارے ہیں۔ کل راہ چلتے لوگوں کو مار کر کپڑے

ازار کرو گے۔ میں تمہارا پکا بندوبست کردوں گا۔"

ہو سکتا ہے کوئی مجھ پر اعتراض کرے کہ میں نے ایک مشتبہ اور مجرم کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ میں پہلے کسی کہانی میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بھی میرا ایک طریقہ تھا کہ میں بعض اوقات مشتبہ افراد کو اس طرح کھلا چھوڑ دیا کرتا تھا جیسے میں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا اور میں بدھو ہوں۔ ایسے لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے مخبروں کے جال میں گرفتار ہیں اور وہ کوئی حرکت زمین کے اندر جاکر کریں وہ بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ اس طرح یہ لوگ میری تفتیش میں نادانستہ طور پر بہت مدد کرتے تھے۔ بگو کو بھی میں نے اسی اصول کے تحت چھوڑ دیا تھا۔ البتہ اسے ہر صبح تھانے میں آنے کا پابند کیا تھا اور نمبردار کو اس کا ضامن ٹھہرایا تھا۔

ایک اور قتل

رات کو میں دیر سے سویا۔ صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی۔ بیوی نے بتایا کہ ایک کانسٹیبل آیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک واردات آئی ہے۔ میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر تھانے میں گیا تو وہاں بگو بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"مجھے باندھ لو سرکار، میں قاتل ہوں۔"

مجھے ایسے لگا جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں۔ بگو اور اس کی بیوی نے لاش کو صرف لوٹا ہی نہیں تھا بلکہ قتل بھی انہی نے یا دونوں نے کیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا —— "قتل کس طرح کیا ہے؟" —— اس نے جواب دیا —— "گلا دبایا اور مر گئی۔"

"کار کس کی تھی؟" میں نے پوچھا — "لڑکی کس کے ساتھ آئی تھی؟"

"کون سی کار؟" بکو نے حیران ہو کر پوچھا — "آپ کس کی بات کر رہے ہیں سرکار؟"

"اس لڑکی کی جس کی لاش برآمد ہوئی ہے۔"

"نہیں سرکار" اس نے کہا — "میں اپنی بیوی کی بات کر رہا ہوں سرکار۔ میں اپنی بیوی کو قتل کر آیا ہوں۔"

یہ سن کر مجھے چکر آ گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ میری تفتیش ختم ہوئی مگر یہ قتل کا ایک اور کیس آ گیا۔ میں نے اس کا بیان سنا۔ مختصر طور پر یہ واقعہ اس طرح ہوا۔ بکو اپنی بیوی کی بدکاریوں اور فرمائشوں سے تنگ آ گیا تھا۔ اسے دوستوں نے بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ یار، اس فاحشہ کو چلتا کرو، تمہاری عزت ختم ہو چکی۔ اور لوگ تمہاری مردانگی پر شک کرتے ہیں۔ مگر وہ امو کو سمجھاتا رہا اور اس کی منتیں بھی کرتا رہا۔ امو کو بدکاری کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ باز نہ آئی بلکہ اسے یہ کہنے لگی کہ مجھے زیور کی تین چار چیزیں لا دو۔ پھر میں تمہاری غلام بن کر رہوں گی۔ بکو کو ایک رات اس شہری لڑکی کی لاش نظر آئی تو اس نے اس کا زیور اتار کر اپنی بیوی کی فرمائش پوری کر دی مگر وہ پکڑا گیا۔ اس کی بیوی اتنی شوباز اور احمق تھی کہ شہری فیشن کی چیزیں جو لاش سے اتاری گئی تھیں، وہ شادی کے موقع پر پہنے پھرتی تھی اور اس نے لاش کے کپڑے اُس وقت بھی پہنے رکھے جب پولیس گاؤں میں موجود تھی۔

میں بکو کو تھانے لے آیا تھا۔ لاش کے کپڑے اور زیورات بھی لے آیا تھا۔

اب اس نئے قتل کی کاغذی کارروائی کرنی تھی۔ بکو نے بیان دیا کہ رات کے گھر گیا

وہ تھانے سے رخصت ہو کر اپنے گاؤں پہنچا تو گاؤں کے لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ گاؤں کے کسی گھر میں پولیس جائے، وہاں سے مال برآمد کرے اور اس گھر کے کسی آدمی کو تھانے لے جائے تو یہ معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ لوگ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بگّو کا گھر بھی گاؤں کے لیے تماشہ گاہ بن گیا تھا۔ پولیس نے کارروائی تو خفیہ کی تھی لیکن سب کو پتہ چل گیا تھا کہ بگّو کے گھر سے چوری کا مال برآمد ہوا ہے۔ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ بگّو نے لاش کا زیور اور کپڑے اتارے ہیں۔ وہ رات کو گاؤں میں داخل ہوا تو لوگ انتظار میں تھے۔ انہوں نے اسے گھیر لیا اور گاؤں کے بزرگوں کے سامنے بٹھا دیا۔ اسے کہا گیا کہ لوگ چوری چکاری تو کرتے ہیں۔ مردوں کی طرح ڈاکے بھی ڈالتے ہیں۔ یہ تُو نے کیا کیا کہ لاش کے کپڑے اتار لیے!

یہ دیہاتی لوگ تھے جو توہم پرست بھی ہوتے ہیں۔ انہوں نے بگّو کو لعن طعن کی اور کہا کہ لوگ ننگی لاش پڑی دیکھیں تو اس پر کپڑا ڈال دیتے ہیں اور تُو نے عورت ذات کی لاش کو ننگا کر دیا۔ اب خدا جانے اس گاؤں پر کیا آفت ٹوٹے گی — لوگ چونکہ بھڑکے ہوئے تھے اس لیے اسے یہ بھی کہہ دیا — "ایک تیری بیوی ہے جس نے سارے گاؤں کو گندا کر رکھا ہے۔ تُو مرد ہے تو طلاق دے حرامزادی کو اور چلتا کر۔ اور تو تو اسے لاشوں کے کپڑے اور زیور اتار کر پہنا رہا ہے۔ کل تو گاؤں کی بیٹیوں کے بھی کفن اتارے گا۔"

بگّو کچھ بھی نہ بولا۔ اس نے بزرگوں کے پاؤں پکڑ لیے اور وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ اپنے گھر گیا تو بیوی منہ بسورے بیٹھی تھی۔ اس نے بگّو کو پہلی بات یہ کہی — "میں پہلے

روز ہی جان گئی تھی کہ تُو مرد ہی نہیں ہے۔ تھانیدار نے ذرا سا رعب دیا اور "تُو بک پڑا" ___ اور اس نے اس طرح کی جلی کٹی اور باتیں اسے کہہ دیں۔ بگو خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ چپ ہوئی تو بگو نے صرف اتنا کہا ___ "میں جانتا تھا کہ تُو بدکار ہے، لیکن اپنی عزت کی خاطر میں نے تجھے خوش کرنے کے لیے جوا کھیلا اور پھر تیری خوشی کے لیے میں نے لاش کا زیور اتارا اور تُو نے لاش کا ستر ننگا کیا۔ اب تجھے طلاق نہیں ملے گی اور اب تو کسی کی بیوی نہیں بنے گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور امّو کی گردن اپنے ہاتھوں میں دبا لی۔ چھوڑا اُس وقت جب وہ مر گئی۔ اس نے لاش کو کندھے پر اٹھایا۔ گاؤں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ وہاں لاش کو پھینکا اور بڑی زور زور سے مختلف آدمیوں کو آوازیں دینے لگا۔ تھوڑی دیر میں سارا گاؤں اس کے گرد جمع ہو گیا۔ بعض لوگ دیئے اور لالٹینیں جلا لائے۔ دیکھا کہ وہاں امّو کی لاش پڑی ہے۔

بگو نے سب سے کہا ___ "میں نے تم سب کا نام بدنام کیا ہے، صرف اس عورت کو خوش رکھنے کے لیے۔ یہ دیکھ لو۔ تم سب کو خوش رکھنے کے لیے میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اب مجھے بخش دو۔ میرے گناہ بخش دو۔ میں تھانے جا رہا ہوں" ___ لوگ حیران و ششدر کھڑے رہے اور بگو تھانے پہنچ گیا۔

اس نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا ___ "اس کا پہلا خاوند بزدل تھا جس نے اسے طلاق دے دی تھی۔ ایسی عورت کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

یہ کیس میرے لیے آسان تھا۔ صرف شہادت اکٹھی کرنی تھی۔ اقبال جرم ہو تھا۔ میں نے بگو کو حوالات میں بند کیا۔ اس کے گاؤں گیا۔ لاش دیکھی۔ قا

اعتماد چار آدمیوں کے بیان لیے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوائی۔ تمام تر کاغذات تیار کیے اور جب میں تھانے میں واپس گیا تو شام کے چار بج رہے تھے۔ وہاں دو آدمی بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ تھانے کے احاطے کے باہر ایک پرانی سی کار کھڑی تھی۔ یہ غالباً اسی میں آئے تھے۔ ایک بوڑھا تھا اور دوسرا جوان، بوڑھے کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ معلوم ہوتی تھی اور جوان چھبیس ستائیس سال کا ہوگا۔ دونوں امیر خاندان کے آدمی تھے۔ بوڑھے نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام حمیدالدین تھا اور جوان آدمی اس کا داماد تھا جس کا نام اعجاز حسین بتایا گیا۔ بڑے میاں انبالہ سے آئے تھے۔ اعجاز حسین میرے شہر میں ٹھیکیداری کرتا تھا۔ بڑے میاں کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا جس میں لڑکی کی لاش کے چہرے کی تصویر چھپی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ تصویر غالباً اس کی بیٹی کی ہے۔ اس نے کہا۔

"اس کا چہرہ اتنا بھرا بھرا نہیں تھا لیکن اسی کی معلوم ہوتی ہے"۔

"یہ تصویر مرنے کے چوتھے روز لی گئی تھی"۔ میں نے اسے بتایا۔ "چہرہ پھولا ہوا تھا۔ اب اگر لاش قبر سے نکالی گئی تو اور زیادہ خراب ہو چکی ہوگی"۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ نے یہ تصویر کب دیکھی ہے؟ یہ تو تین چار دن پرانا اخبار ہے"۔

"یہ کل صبح یہاں آکر دیکھی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کے داماد، اعجاز حسین سے پوچھا۔ "آپ تو یہیں تھے۔ آپ نے اپنی بیوی کی تصویر نہیں پہچانی؟"

"میں نے بھی کل ہی دیکھی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

لڑکی کے باپ نے کہا ۔۔۔ "مجھے پرسوں انبالہ میں اس کا (اعجاز حسین، داماد کا) خط ملا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کلثوم (مقتولہ) مجھے بتائے بغیر آپ کے پاس چلی گئی ہے۔ وہ کب واپس آ رہی ہے۔ کیا میں اسے لینے آؤں؟ کلثوم انبالہ نہیں آئی تھی۔ مجھے پریشانی ہوئی۔ میں اسی وقت گاڑی میں بیٹھا اور یہاں آ گیا۔ اعجاز کو بتایا کہ کلثوم انبالہ نہیں آئی۔ یہ بھی پریشان ہو گیا۔ اسے گئے ہوئے چھ سات روز ہو گئے تھے۔ اعجاز نے مجھے بتایا کہ کئی بار وہ فیروز پور اپنے ماموں کے ہاں گئی تھی۔ ہم نے اس کے ماموں کو تار دیا۔ اس کا جواب کل صبح دس بجے بذریعہ تار ملا۔ اس نے لکھا ہے کہ کلثوم فیروز پور نہیں گئی۔ یہی دو جگہیں تھیں جہاں وہ جا سکتی تھی۔ اعجاز کو اچانک یاد آیا کہ اخبار میں کسی لڑکی کی تصویر شائع ہوئی تھی جو قتل ہو گئی ہے اور اس کے وارث نہیں مل رہے۔ اس نے تین چار روز پرانے اخبار دیکھے اور ہم دونوں تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔ صرف چہرہ تھا، آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ موٹا تھا۔ اس لیے ہم پوری طرح پہچان نہ سکے۔ مجھے ستر فیصد یقین ہے کہ یہ کلثوم کی تصویر ہے۔ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر گئے۔ وہاں سے ہمیں آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔"

"میں آپ کو وہ کپڑے اور زیورات دکھا سکتا ہوں جو لڑکی کی لاش سے اتارے گئے ہیں۔" میں نے کہا ۔۔۔ "آپ ان کی مدد سے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔" ۔۔۔ میں نے سب سے پہلے شلوار، قمیض اور دوپٹہ ان کے آگے رکھا۔

باپ انہیں دیکھ کر یاد کرنے لگا۔ اس نے ماتھے کو ہاتھ سے رگڑا۔ آخر بولا ۔۔۔ "میرا ... ہے کلثوم ایک بار انبالہ اس سوٹ میں آئی تھی۔"

"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔" اعجاز حسین نے کہا ۔۔۔ "اس کے کپڑوں کو آپ

مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ اس کے پاس ایسا کوئی سوٹ نہیں تھا۔"

"یہ زیورات دیکھ لیں۔" میں نے تمام زیورات ان کے آگے رکھ دیئے۔

باپ نے ہر ایک چیز کو الگ الگ دیکھا۔ اس نے ایک انگوٹھی اور زنجیر کا بٹا پہچان کر کہا ـــــ "ان دونوں چیزوں کو میں پہچانتا ہوں۔ زنجیر میرے ہاتھ کی خریدی ہوئی ہے اور یہ انگوٹھی بھی اسے ہم نے دی تھی۔"

"یہ دونوں چیزیں کلثوم کی نہیں ہیں۔" اعجاز حسین نے کہا ـــــ "چھ مہینے گزرے اس نے ضد کی تھی کہ وہ زنجیر اور بٹا بدل کر ایک اور ڈیزائن کی زنجیر اور لاکٹ لینا چاہتی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے زنجیر دے کر لاکٹ والی زنجیر لے لی تھی۔ مجھے اڑھائی سو روپیہ اس کے ساتھ ادا کرنا پڑا تھا اور انگوٹھی وہ ایک ہی انگلی میں رکھتی تھی۔ یہ دو انگوٹھیاں ہیں۔"

پھر میں نے انہیں چوڑیاں اور سینڈل دکھائے۔ باپ نے کہا کہ ان کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اعجاز حسین نے کہا ـــــ "میں پورے اعتماد کے ساتھ بات کر سکتا ہوں۔ اس نے کانچ کی چوڑیاں کبھی پہنی ہی نہیں تھیں اور یہ سینڈل تو اس کی پسند کے ہیں ہی نہیں۔ وہ ہلکے پھلکے سینڈل پسند کرتی ہے۔"

باپ خاموش ہو گیا۔ وہ بار بار اخبار کے فوٹو کو دیکھتا تھا۔ میں نے میز کی دراز کھولی۔ اس میں اصل فوٹو کی ایک کاپی پڑی تھی۔ میں نے وہ ان کے آگے رکھ دی اور کہا کہ اخبار میں تصویر صاف نہیں آئی۔ آپ یہ دیکھ لیں۔ فوٹو سب سے پہلے اعجاز نے دیکھی اور فیصلے کے لہجے میں بولا ـــــ "او، بالکل نہیں۔ یہ کلثوم کی تصویر نہیں۔ اگر چہرہ پھولا ہوا نہ ہوتا اور اگر آنکھیں کھلی ہوتیں تو بھی یہ کلثوم کا چہرہ نہیں ہے۔"

نذر ٹوباپ نے لے لی۔ بہت دیر دیکھتا رہا اور کہنے لگا ـــ" کلثوم میری بچی ہے، وہ چونکہ لاپتہ ہے، اس لئے آنکھوں کے سامنے اسی کی تصویر ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کبھی یہ چہرہ اسی کا لگتا ہے اور کبھی یقین آجاتا ہے کہ یہ میری بچی کا چہرہ نہیں یہ (اعجاز) کہتا ہے کہ یہ کپڑے اس کے نہیں ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

سُسر، داماد اور مقتولہ

اعجاز حسین نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ یہ اس کی بیوی کی تصویر نہیں۔ اس کا سسر بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ میں نے اعجاز سے کہا ـــ" آپ نے کہا تھا کہ آپ کی بیوی آپ کو بتائے بغیر اپنے والدین کے ہاں انبالہ چلی گئی ہو گی۔ کیا اس سے پہلے بھی وہ آپ کو بتائے بغیر کبھی گئی ہے؟"

" چار پانچ دفعہ مجھے بتائے بغیر گئی ہے۔"

" کوئی وجہ؟"

" لڑ کر گئی تھی۔" اس نے کہا ـــ" اب بھی لڑ کر گئی ہے۔ یہ اس کی عادت ہے"

" اس کی نہیں۔ یہ تمہاری عادت ہے۔" اس کے سسر نے غصے میں کہا ـــ" وہ جتنی بار گھر آئی ہے اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسے پریشان کرتے ہو اور طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے ہو۔"

فوراً ہی وہ جھگڑنے لگے۔ میں اس پر پچھتانے لگا کہ ان دونوں کا مقتولہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر میں یہ سوال کیوں کر بیٹھا کہ وہ پہلے بھی کبھی بتائے بغیر گئی تھی؟ ان کا جھگڑا بڑھ گیا۔ اعجاز حسین نے اپنے سسر سے کہا ـــ" آپ مجھے

جھانسہ دے رہے ہیں۔ آپ کی بیٹی آپ کے پاس گئی ہے۔ آپ نے اسے چھپا لیا ہے اور مجھے کہہ رہے ہیں کہ وہ گھر نہیں گئی۔"

"دیکھئے انسپکٹر صاحب!" سسر نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "ایک بار اس ظالم کے بچے نے میری بیٹی کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ پانچ چھ روز میرے گھر رہی اور واپس آگئی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ کم بخت کا بچہ شراب پیتا ہے اور رنڈی بازی بھی کرتا ہے۔ اب مجھے دھمکیاں دیتا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کو چھپا لیا ہے۔ جناب، مجھے شک ہے کہ اس نے میری بیٹی کو یا قتل کر دیا ہے یا قتل کروا دیا ہے۔"

اعجاز حسین بھڑک اٹھا اور بولا۔ "اور اپنی بیٹی کے کرتوت آپ نہیں بتائیں گے؟ آپ مجھے رنڈی باز کہتے ہیں۔ وہ تو خود رنڈی بنی ہوئی ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

سسر نے چلا کر کہا۔ "بکواس بند کر کتے کے بچے۔"

میں نے انہیں خاموش کرا کے کہا۔ "یہ پولیس سٹیشن ہے جناب، آپ کا گھر نہیں ہے۔ آپ اگر اس لڑکی کو شناخت کر سکتے ہیں تو مجھ سے بات کریں ورنہ تشریف لے جائیں۔"

اعجاز حسین فوراً اٹھا اور مجھ سے پوچھا۔ "قبلہ، مجھے بتائیں کہ میں اس کے خلاف کہاں رپورٹ درج کراؤں کہ اس نے میری بیوی کو روپوش کر رکھا ہے۔"

"آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس چلے جائیں۔"

وہ بہت تیزی سے باہر نکل گیا۔ بوڑھا سسر بیٹھا رہا۔ اس نے اعجاز حسین کے خلاف بہت سی باتیں کیں اور اپنی بیٹی کو مظلوم بتایا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ

بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو درخواست دے گا کہ اس نے میری بیٹی کو قتل کرادیا ہے۔ اسے مجبور کیا جائے کہ کلثوم کو عدالت میں لائے۔۔۔ یہ بزرگ میرے لیے ایک اہم گواہ بن سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

کیا آپ لڑکی کی تصویر اور اس کی چیزوں کی شناخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مجھے ہاں یا نہیں جواب دیں"۔

اس نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا، اس کی چیزوں کو دیکھا اور شک کے لہجے میں بولا۔۔۔ "میں ہاں بھی نہیں کہہ سکتا اور نہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ میں ابھی تک شک میں ہوں"۔

میں نے اسے شاملِ تفتیش کر لیا اور اس کا ایڈریس لے کر اسے کہا کہ مجھے جب بھی اور جس وقت بھی اس کی ضرورت پڑی اسے فوراً حاضر ہونا پڑے گا۔ اس نے بخوشی قبول کر لیا اور وہ پھر اپنے داماد کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ بوڑھا اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں خود اٹھا اور اسے یہ کہہ کر اٹھایا کہ میں ایک تفتیش کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ میں اسے تھانے سے باہر لے گیا اور احاطے سے بھی باہر سڑک تک اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا داماد کار لے گیا تھا۔ بوڑھے نے گالی دے کر کہا۔۔۔ "اپنا سامان لینے کے لیے مجھے اس خبیث آدمی کے گھر جانا پڑے گا"۔

میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کہاں تک جائیں گے؟ میں تانگہ رکواتا ہوں۔ اس نے مجھے کوٹھی کا نمبر اور سڑک بتا دی۔ میں نے ایک تانگہ روکا اور بوڑھے سے جان چھڑائی لیکن وہ میرے لیے ایک کارآمد قسم کا شک پیدا کر گیا۔

تانگہ دور نکل گیا تو میں اپنے دفتر کی طرف واپس مڑنے لگا۔ میری نظر زمین پر

پڑی۔ میں وہیں جھک گیا اور کچھ دیر زمین کو دیکھتا رہا۔ ایک دو منٹ بعد مجھے اس طرح معلوم ہوا جیسے میں تھانے کے سامنے نہیں بلکہ اس پگڈنڈی پر کھڑا ہوں، جس کے قریب سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ گواہی جو پگڈنڈی نے دی تھی، وہی گواہی میرے تھانے کے سامنے کی زمین دے رہی تھی۔ یہ ایک تنگ سڑک تھی جس کے ساتھ خاصی چوڑی کچی زمین تھی۔ اس پر مجھے چار پانچ انچ جگہ پر تیل گرا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس کے دائیں اور بائیں ایک کار کے ٹائروں کے نشان تھے۔ تیل کا یہی دھبہ میں نے ٹائروں کے اسی قسم کے نشانوں کے درمیان پگڈنڈی پر دیکھا تھا۔ پگڈنڈی پر جو نشان تھے، ان سے مجھے اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ اس ویرانے میں وہاں تک ایک موٹر گاڑی گئی ہے، وہاں رکی ہے اور وہیں سے واپس ہوئی ہے۔

ٹائروں کے نشان پر کسی مجرم کو نہیں پکڑا جا سکتا کیونکہ ایک ہی قسم کے ٹائر اتنے بڑے شہر میں سینکڑوں گاڑیوں کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان نشانوں میں جو مجھے پگڈنڈی پر اور پھر سڑک کے کنارے کچی زمین پر نظر آئے تھے، دو چیزیں مشترک تھیں۔ ایک یہ تھی کہ ان کے درمیان تیل کا دھبہ تھا۔ کار پرانی تھی جس سے تیل ٹپکتا تھا قطرہ قطرہ۔ دوسری یہ کہ ایک ٹائر گھسا ہوا تھا۔ اس کا نشان پگڈنڈی پر بھی ایسا ہی تھا اور میرے تھانے کے سامنے بھی ایسا ہی۔ میں نے پگڈنڈی پر تیل کا دھبہ دیکھ کر بھی سوچا تھا کہ کار بہت پرانی ہے۔

میں جب گاؤں سے آتے ہوئے تھانے تک پہنچا تھا تو کریم رنگ کی ایک کار یہاں کھڑی دیکھی تھی۔ اندر گیا تو یہ سسر اور داماد میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

اب باہر آیا تو کار داماد (اعجاز حسین) لے جا چکا تھا۔ کار اسی کی تھی۔ ٹائروں کے نشان دیکھ کر میرے ذہن میں اعجاز اور اس کے سسر کا جھگڑا گونجنے لگا۔ آپ ان کی تکرار پڑھ چکے ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اعجاز اور اس کی بیوی کی آپس میں ناچاقی تھی اور ناچاقی بھی اس حد تک تھی کہ اعجاز نے، سسر کے بیان کے مطابق، ایک بار اپنی بیوی کو مار پیٹ کر نکال دیا تھا اور وہ اپنے والدین کے پاس انبالہ چلی گئی تھی۔

سسر اعجاز کو شرابی وغیرہ کہہ رہا تھا اور اعجاز اپنی بیوی کو رنڈی کہہ رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ تین چار بار لڑ کر اپنے والدین کے ہاں اسے بتائے بغیر چلی گئی تھی --- میرا دماغ اور میری نظر ایک پولیس مین کی تھی۔ اس لیے میں بال کی کھال اتارنے لگا۔ ان دونوں کا ایک ایک لفظ یاد کر کے، وہیں کھڑے کھڑے، اپنے دماغ میں الٹنے پلٹنے لگا۔ میں نے اس وقت جب وہ میرے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ان کی باتوں سے توجہ ہٹالی تھی کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ مقتولہ کو شناخت نہیں کر سکے اور مقتولہ کے کپڑے اور زیورات دیکھ کر اعجاز نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ اس کی بیوی کے کپڑے نہیں۔ یہ سن کر میں انہیں ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب ٹائروں اور نیل کا نشان دیکھ کر میں ان کی باتیں یاد کرنے لگا۔

سسر نے کہا تھا کہ اعجاز نے اس کی بیٹی کو قتل کر دیا یا کروا دیا ہے۔ گویا نوبت ایسے شکوک تک پہنچی ہوئی تھی۔ پھر مجھے خاص طور پر یاد آیا کہ لڑکی کے باپ نے کپڑے، انگوٹھی اور گلے کی زنجیر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ چیزیں اس کی بیٹی کی ہیں مگر اعجاز نے اس کی تردید کر دی تھی۔ باپ جو چیز دیکھتا تھا سوچ میں پڑ جاتا تھا اور اعجاز فوراً

کہہ دیتا تھا کہ نہیں، یہ اس کی نہیں۔ تصویر دیکھ دیکھ کر باپ کہتا تھا کہ یہ کلثوم کی ہے اور پھر شک میں پڑ جاتا تھا اور اعجاز نے صاف کہہ دیا کہ یہ اس کی بیوی کی تصویر نہیں۔ مجھے اس کا انداز یاد آرہا تھا۔ اب اس کی کار کا نشان دیکھ کر مجھے شک ہونے لگا کہ وہ اس کوشش میں تھا کہ اس کی بیوی کا باپ تصویر کو نہ پہچانے۔

بہر حال یہ تصویر اگر اعجاز کی بیوی کی یا حمیدالدین کی بیٹی کی نہیں بھی تھی تو بھی میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ ایک لڑکی قتل ہوگئی ہے اور جہاں سے لاش برآمد ہوئی ہے، اس کے قریب ایک کار کے ٹائروں کے نشان تھے، ان کے درمیان تیل کا دھبہ تھا۔ یہی نشان میرے تھانے کے سامنے مجھے نظر آئے تھے۔ ان سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ ویرانے میں یہی کار گئی تھی ضروری نہیں کہ کار اعجاز ہی لے گیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی دوست اس کی کار مانگ کر لے گیا ہو اور کسی لڑکی کو اس میں قتل کر کے لاش وہاں پھینک آیا ہو۔ مجھے اس کار کو زیرِ تفتیش لانا تھا۔

میں نے اعجاز سے اس کے کاروبار اور دفتر وغیرہ کے متعلق پوچھا تھا، جو تھانیداروں کی عادت میں شامل ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے اس کے پرائیویٹ دفتر کا علم ہوگیا تھا۔ اس کے سسر سے میں نے اعجاز کی رہائش پوچھی تھی۔ اس نے کوٹھی کا نمبر اور سڑک بتا دی تھی۔ میں نے اپنے ایک ڈی۔ ایف۔ سی (ڈیٹیکٹیو فٹ کانسٹیبل) بشیر احمد اور ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ کو ساتھ لیا۔ تانگہ منگوایا اور اعجاز کی کوٹھی کی طرف چل پڑے۔ اس کے سسر کو تھانے سے گئے کوئی پون گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں جب اعجاز کی کوٹھی تلاش کرتا اس کی کوٹھی میں پہنچا تو معلوم ہوا اس کا سسر جا چکا ہے اور

اعجاز گھر میں نہیں ہے۔ میں نے کوٹھی کے سامنے، برآمدے کے ساتھ دیکھا۔ وہاں ٹہل کر تا رہا تھا۔ میرے سامنے اعجاز کا ایک نوکر کھڑا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ گھر میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ کھانا پکانے تک کا کام یہی نوکر کرتا تھا۔ گھر کے دوسرے کام، جھاڑ پونچھ وغیرہ ایک عورت کرتی تھی جو اس وقت وہاں نہیں تھی۔

بیگم کا چلن اچھا نہ تھا

میں نے نوکر سے پوچھا — "بیگم کہاں ہیں؟" — اس نے لاپرواہی سے جواب دیا — "میں کیا کہہ سکتا ہوں حضور، نو دس روز سے گئی ہوئی ہیں۔ معلوم نہیں کہاں گئی ہیں۔"

میں نے اس کا بے پرواہ انداز دیکھا تو اسے کہا کہ میں ایک قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اس لیے وہ مجھے ہر سوال کا جواب صحیح دے۔ میں نے اس سے بہت سی معلومات حاصل کیں جن سے ظاہر ہوا کہ اعجاز حسین اور اس کی بیوی کے تعلقات کشیدہ تھے اور ان کا آپس میں کئی بار جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ بیگم کا نام کلثوم ہے۔ نوکر میرے اس سوال پر جھجک گیا کہ بیگم کا چال چلن کیسا تھا۔ میں نے اسے ڈرانے دھمکانے کی بجائے دوستانہ طریقے سے بولنے پر آمادہ کر لیا اور اسے یہ احساس بھی دلا دیا کہ اسے آخر گواہی دینی ہی پڑے گی اور اگر اس نے جھوٹ بولا، تو ساری بات کھل جانے پر وہ خواہ مخواہ پکڑا جائے گا — اس نے یہ رائے دی کہ بیگم اچھے چال چلن کی عورت نہیں تھی۔ اعجاز کے متعلق اس نے بتایا کہ گھر میں اس

نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ نوکر کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اعجاز کے تعلقات کسی اور لڑکی کے ساتھ تھے یا نہیں۔ شادی کا یہ تیسرا سال تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا ــــ "تمہیں یاد ہے کہ بیگم گھر سے کس روز گئی تھی"۔

اس نے جواب دیا ــــ "جی ہاں، مجھے یاد ہے۔ شام کا کھانا کھا کر اعجاز صاحب اور بیگم صاحبہ گاڑی میں گئے تھے۔ رات کے شاید گیارہ بجے تھے جب مجھے گاڑی واپس آنے کی آواز آئی۔ میرا اندر کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے میں اندر نہیں گیا۔ صبح ناشتہ لگا رہا تھا تو اعجاز صاحب نے مجھے کہا کہ ناشتہ صرف میرے لیے لگانا، بیگم رات کو انبالہ چلی گئی ہیں۔ میں سمجھا کہ رات کو اعجاز صاحب بیگم صاحبہ کو سٹیشن پر لے گئے تھے۔ اور میں ابھی تک یہ سمجھ رہا ہوں کہ وہ انبالہ گئی ہوئی ہیں"۔

میں نے اپنے کاغذوں میں سے وہ اخبار نکالا جس میں کلثوم کی تصویر چھپی تھی۔ یہ اخبار نوکر کے ہاتھ میں دے کر اسے کہا ــــ "یہ تصویر پہچان سکتے ہو؟"

اس نے تصویر کو آنکھوں سے دور کر کے دیکھا اور بولا ــــ "اللہ جھوٹ نہ بلوائے، یہ بیگم صاحبہ کی تصویر معلوم ہوتی ہے"۔ پھر اور غور سے دیکھ کر بولا ــــ "ہاں حضور، بیگم صاحبہ ہیں"۔ وہ یکلخت گھبرا گیا اور اس کے منہ سے نکلا ــــ "ہائیں، یہ کیا لکھا ہے؟ لاش سول ہسپتال کے سرد خانے میں پڑی ہے؟ ــــ نہیں یہ کوئی اور ہوگی۔ اعجاز صاحب کہتے تھے کہ ....."

"یہی ہے"۔ میں نے کہا۔ "تم نے اس سے پہلے اخبار نہیں دیکھا تھا؟"

"ہم غریب لوگ اخبار کہاں پڑھتے ہیں"۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ یہ بیگم کلثوم کی تصویر ہے؟"

"ہاں حضور!" اس نے جواب دیا۔ "چہرہ ذرا موٹا ہے لیکن تصویر میں اتنا فرق تو آ ہی جاتا ہے۔ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔"

یہ جواب میرے لیے اہم تھا۔ مقتولہ کے باپ نے تصویر کو پہچان لیا تھا لیکن اعجاز نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ یہ کلثوم کی تصویر نہیں۔ باپ تو یہی سننا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس لئے وہ مان گیا کہ یہ اس کی بیٹی نہیں۔ نوکر کے جواب سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تصویر کو ذرا سا غور سے دیکھو تو پہچانی جاتی ہے کہ یہ کس کی تصویر ہے۔

شہادت اعجاز حسین کے خلاف اکٹھی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے نوکر سے پوچھا کہ اعجاز صاحب کس وقت آئیں گے؟ سورج غروب ہو چکا تھا۔ نوکر نے بتایا کہ انہیں اب آ ہی جانا چاہیئے۔ میں نے نوکر سے کہا کہ ہم یہیں برآمدے میں بیٹھیں گے۔ وہ چلا جائے اور اعجاز کو بالکل نہ بتائے کہ میں نے اس سے کوئی بات کی یا پوچھی ہے۔

میں برآمدے میں بیٹھا رہا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی، معاملہ یقینی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اعجاز کو کون سے طریقے سے اقبال جرم کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔ نصف گھنٹہ گزر گیا ہو گا جب اس کی گاڑی برآمدے کے سامنے آ کر رکی۔ میں اس کے استقبال کے لیے اٹھا۔ وہ گاڑی سے نکلا تو مجھے دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ فوراً ہی ہنس پڑا اور میری طرف ہاتھ لمبا کر کے بولا ـــــ "معلوم ہوتا ہے میرا سسر آپ کو شک میں ڈال آیا ہے" ـــــ اس نے ہاتھ ملایا اور مجھے اندر لے گیا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اسے کہا کہ اس کے سسر کو میں نے جلدی اٹھا دیا تھا اور اس کی میں نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ میں نے لڑکی کی تصویر اس کے ہاتھ

ہیں دے دی' جسے وہ دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے دل کا چور جاگ اٹھا تھا۔ وہ چپ رہا۔

"اعجاز صاحب"۔ میں نے اطمینان کے لہجے میں پوچھا۔ "یہ تصویر کس کی ہے؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ کسی اور کی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کے گھر سے آپ کی بیوی کی کوئی تصویر لے کر اس تصویر کے ساتھ ملاؤں؟" میں نے کہا۔ "آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ ہمارے پاس ایسے سپیشلسٹ بھی ہوتے ہیں"۔

"کیا آپ مجھ سے خواہ مخواہ منوانا چاہتے ہیں کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے؟" اس نے کہا اور مجھ سے پوچھا۔ "آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"اعجاز صاحب"۔ میں نے کہا۔ "میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ ہمیں ایک لڑکی کی لاش ملی ہے۔ اس کی شکل آپ کی بیوی سے ملتی ہے۔ میں مجبور ہوں کہ آپ سے چند ایک الٹے سیدھے سوال کروں تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ یہ آپ کی بیوی نہیں ہے۔ میں آپ پر کوئی چیز ٹھونس نہیں رہا۔ میں آپ کو کوئی بھی الزام تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کروں گا۔ میں نے آپ کی عزت افزائی کی ہے کہ میں یہاں آ گیا ہوں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ہم سوال و جواب کے لیے تھانے بلایا کرتے ہیں۔ آپ بالکل نہ مانیں کہ یہ آپ کی بیوی کی تصویر ہے"۔۔۔ میرے ٹھنڈے رویے سے وہ کچھ سنبھل گیا۔

"آپ کا کاروبار شاید اچھا نہیں چل رہا؟" میں نے کہا۔

"آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ آپ گاڑی کا وہ ٹائر بھی تبدیل نہیں کرا سکتے جو گھس گیا ہے"

میں نے کہا۔ "گھسا بھی اتنا ہے کہ ربڑ کئی جگہوں سے اُڑ گیا ہے"۔ میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "گاڑی اتنی پرانی ہے کہ اس میں سے تیل گرتا رہتا ہے"۔

"آپ نے میری گاڑی ابھی ابھی دیکھی ہے"۔ اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "پولیس کی آنکھیں بہت تیز ہوتی ہیں"۔

"نہیں اعجاز صاحب"۔ میں نے اسے کہا۔ "آپ کی گاڑی یہاں رکی تو میری نظر آپ پر تھی۔ میں نے تو آپ کی گاڑی کا رنگ بھی نہیں دیکھا البتہ اس سے پہلے آپ کی گاڑی ایک ایسی جگہ کھڑی دیکھی تھی جہاں بہت کم گاڑیاں جایا کرتی ہیں"۔

"کہاں؟"

"جہاں آپ نے اپنی بیوی کی لاش پھینکی تھی"۔

وہ پیشہ ور قاتل نہیں تھا۔ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ آنکھوں کے ڈھیلے باہر نکل آئے اور منہ کھل گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے نہ دیا۔ میں نے کہا۔ "اگر اسے قتل ہی کرانا تھا تو کسی پیشہ ور کو پیسے دے کر کرا دیتے۔ قتل کر دینا کوئی مشکل نہیں لیکن آپ کو یہ علم نہیں تھا کہ جہاں قتل کیا جاتا ہے، وہاں کی بے زبان چیزیں، دیوار کی زمین اور لاش بھی گواہی دے دیا کرتی ہے۔ میں آپ کے پاس کسی شک کی بنا پر نہیں آیا اور آپ کے سسر کی باتیں بھی مجھے متاثر نہیں کر سکی تھیں۔ مجھے آپ کی بیوی کی لاش یہاں تک لے آئی ہے اور میں آپ کی اس گاڑی پر یہاں آیا ہوں جس کا ایک ٹائر گھسا ہوا ہے اور جہاں رکتی ہے وہاں تیل کے چند ایک قطرے گراتی ہے۔ میں مکمل شہادت اور ثبوت لے کر آیا ہوں"۔

"آپ ..."، وہ سخت گھبرا گیا۔ تین بار اس نے کہا ـــ "آپ ... آپ ... آپ ..."

"آپ اتنا زیادہ نہ گھبرائیں۔" میں نے اسے کہا۔ "آپ میرے ساتھ تعاون کریں اور مجھ سے تعاون کی توقع رکھیں۔ ورنہ آپ کو بہت ہی زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا جس میں آپ کی جان کا نقصان بھی شامل ہے۔ میں اگر آپ سے کچھ بھی نہ پوچھوں اور آپ کو گرفتار کر کے لے جاؤں تو بھی میں آپ کے خلاف بیوی کے قتل کا جرم ثابت کر سکتا ہوں۔ آپ باعزت خاندان کے فرد ہیں۔ میں آپ کی تھوڑی سی مدد کر سکتا ہوں۔ آپ کچھ میری مدد کریں۔"

اس نے اپنے بیگ سے چیک بک نکالی اور چیک لکھ کر میرے آگے کر دیا۔ اس پر پانچ ہزار روپے کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ میں نے چیک صرف دیکھا، ہاتھ میں نہیں لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

"اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو میں رقم زیادہ کر دوں گا۔ آپ یہ کرم کریں کہ کیس گول کر دیں۔ لاش کو لاوارث قرار دے دیں۔ اس کا باپ مان گیا ہے کہ یہ لاش کلثوم کی نہیں ہے۔"

"میرے لیے یہ مصیبت پیدا ہو گئی ہے کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لاش کلثوم کی ہے۔" میں نے کہا ـــ "آپ کے یہ پانچ ہزار یا دس پندرہ ہزار میں کب تک کھاؤں گا۔ آپ چیک اپنے پاس رکھیں اور میرے کچھ سوالوں کا جواب دے دیں۔ پھر میں آپ کو کوئی راستہ بتا دوں گا۔"

"پوچھیے۔"

"بدکار آپ تھے یا آپ کی بیوی؟"

"میری بیوی۔"

"آپ پوری بات سنا دیں۔" میں نے کہا ۔۔۔ "پھر میں آپ سے بات کروں گا۔"

دو بدکار بیویاں

اس نے وہی کہانی سنائی جو آپ ہزار مرتبہ سن چکے ہوں گے۔ میری اس تفتیش میں بھی آپ ایسی ایک کہانی پڑھ چکے ہیں۔ یہ بگّو اور اس کی بدکار بیوی کی کہانی ہے۔ اس میں دیہات کی ایک گنوار لڑکی بدکار تھی، یہاں ایک اونچے اور امیر خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی بدکار تھی۔ اعجاز نے اسے بالکل بگّو کی طرح اپنی عادتیں بدلنے کے لیے کہا تھا مگر کلثوم ایک جاگیردار کی بیٹی تھی جس نے گھر میں مزارعوں اور نوکروں چاکروں پر حکومت کی تھی۔ وہ اپنے خاوند کو بھی اپنا نوکر سمجھتی تھی۔ اعجاز نے اپنے سسر سے ایک بار شکایت کی تو سسر نے اعجاز کو ہی گالیاں دیں۔

اس کے بعد لڑکی کئی بار اعجاز سے لڑ جھگڑ کر میکے چلی گئی۔ اعجاز نے مجھے بتایا کہ کلثوم کو اپنے ماں باپ نے دولت اور جاگیرداری کے نشے میں کھلی آزادی دے کر آوارہ کر دیا تھا۔ اعجاز کو اس لڑکی سے محبت تھی اور اس کے ساتھ یہ دلچسپی بھی کہ ماں باپ کی گمراہ کی ہوئی لڑکی کو وہ راہِ راست پر لے آئے۔ اعجاز کے بیان کے مطابق، کلثوم کو دوستیاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اعجاز کے دو عزیز دوستوں سے بھی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اعجاز اب ہر جگہ رسوا ہونے لگا تھا۔

ایک رات کلثوم گھر دیر سے آئی۔ اعجاز نے اسے مارا پیٹا۔ دوسرے دن کلثوم

انبالہ چلی گئی۔ دو تین روز بعد اعجاز کو سسر کا خط ملا کہ وہ فوراً انبالہ پہنچے۔ اعجاز چلا گیا۔ اسے توقع تھی کہ صلح صفائی کی کوئی بات ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ سسر نے اپنے دو مزارعوں کو بلا کر اسے ان سے پٹوایا اور کہا کہ واپس چلے جاؤ۔ اعجاز واپس آگیا۔ وہ ذرا کمزور خاندان کا آدمی تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔ اسے توقع تھی کہ جھگڑا مار کٹائی تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے اب کلثوم کو ماں باپ اس کے پاس نہیں بھیجیں گے، وہ ایک وکیل سے مشورہ کر رہا تھا۔

اس کے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ حق مہر کی رقم بہت زیادہ تھی۔ طلاق دی جاسکتی تھی۔ مگر حق مہر دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اگلے روز کلثوم آگئی۔ اب وہ شہزادی بن کے آئی تھی جیسے اعجاز اس کا غلام ہو گیا ہو۔ اس نے آتے ہی اعجاز کو دو تین حکم سنا ڈالے۔ اس رویے سے اعجاز کا دماغ پھر گیا۔ وہ اتنا غلام نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کی نظر میں یہ بے غیرتی تھی۔ اس سے وہ اس قدر مشتعل ہوا کہ اس نے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن سوچتا رہا کہ قتل کس طریقے سے کرے تاکہ پکڑا نہ جائے۔ اس دوران وہ کلثوم کا غلام بنا رہا۔

ایک شام کھانے کے کچھ دیر بعد اعجاز نے اسے کہا ــ "ایک روز میری بھی ذرا سی بات مان لو۔ آؤ سیر کو چلیں، دیکھو کتنی اچھی چاندنی ہے"۔ وہ فوراً تیار ہوگئی ــ وہ اسے پہلے تو ادھر اُدھر گھماتا پھراتا رہا۔ پھر اسے اس ویرانے میں لے گیا۔ کلثوم نے اسے تین چار بار کہا کہ وہ اس جنگل اور اجاڑ میں نہیں جائے گی مگر اعجاز نے گاڑی نہ روکی۔ وہ اسے بہت دور لے جا کر قتل کرنا چاہتا تھا لیکن ایک جگہ کلثوم بری طرح بگڑ بیٹھی۔ اعجاز

نے گاڑی روک دی اور کلثوم سے کہا — "اچھا واپس چلتے ہیں" — اس نے جیب سے رومال نکالا، اور کلثوم جو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی، کی ناک اور منہ پر رکھ دیا۔ اس قدر دباؤ ڈالا کہ کلثوم کا سر پیچھے سیٹ کے ساتھ لگ گیا۔ اعجاز نے تہہ کیا ہوا رومال اس کی ناک اور منہ پر رکھے ہوئے اوپر سے ہتھیلی کا دباؤ ڈالے رکھا۔ وہ تڑپتی رہی اور ذرا سی دیر میں وہ مر گئی۔ اس نے لاش باہر نکالی اور اٹھا کر تھوڑی دور پھینک دی۔ اس ویرانے میں قتل کر کے پھینکنے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں رات کے وقت گیدڑ وغیرہ اسے کھا کر حلیہ بگاڑ دیں گے اور جو کچھ بچ جائے گا، وہ دن کے وقت گدھ کھالیں گے۔

اعجاز نے جب اخبار میں کلثوم کی تصویر دیکھی تو اس نے فوراً پہچان لی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے اسی روز اس کے باپ کو خط لکھا جس میں پوچھا کہ آج چوتھا روز ہے، کلثوم انبالہ گئی تھی۔ وہ خود آجائے گی یا میں آؤں۔ یہ خط ملتے ہی اس کا سسر بھاگا آیا اور بتایا کہ کلثوم انبالہ نہیں گئی۔ اعجاز نے اسے اخبار میں تصویر دکھائی جسے کلثوم کے باپ نے پہچان لیا لیکن اعجاز نے بڑی کامیاب چالاکی سے اسے باور کرادیا کہ یہ کوئی اور ہے۔

اس کے بعد تھانے میں میرے سامنے جو کچھ ہوا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ اعجاز مجسٹریٹ کے سامنے اقبالِ جرم کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اُس رات میرے تھانے کی حوالات میں دو خاوند بند تھے۔ دونوں کا کیس ایک ہی تھا۔ دونوں کی بیویاں بدچلن تھیں۔ دونوں اپنی بیویوں کے قاتل تھے۔ ایک غریب اور اجڈ دیہاتی تھا اور دوسرا گریجویٹ اور کوٹھی میں رہنے والا شہری

کتاب کا کور

عامر بلال

رابطہ

فیس بک

https://www.facebook.com/aamiralibilal

ٹویٹر

http://twitter.com/aamirbilal

انسٹاگرام

https://www.instagram.com/aamirbilal

یوٹیوب

https://www.youtube.com/@aamirbilal

شہزادہ مگر حوالات میں دونوں فرش پر بیٹھے ایک ہی انداز میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہے تھے۔ دونوں کے جذبات اور احساسات ایک جیسے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انسان گنوار ہو یا گریجویٹ اس کی بنیادی فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔

دونوں مقدمے اکٹھے چلے۔ بکّو نے جرم سے انکار نہیں کیا۔ اس کے گاؤں کے دس آدمی اور اس کی بیوی کا پہلا خاوند بمع تین آدمی اس کی صفائی کے لیے عدالت میں آئے اور شہادت دی کہ اس کی بیوی بدچلن تھی۔ سیشن کورٹ نے اسے سات سال سزائے قید دی، جو اپیل میں ہائی کورٹ سے پانچ سال ہو گئی ــــ میں نے اس پر یہ کرم کیا کہ لاش روپوش کرنے اور لاش کی چیزیں چوری کرنے کے جرم میں اس کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہیں کیا ـــــ اس کا فائدہ اعجاز حسین کو بھی مل گیا جو دراصل میری غلطی تھی۔ استغاثہ میں تھا کہ لاش گڑھے میں دفن شدہ برآمد ہوئی مگر اقبالِ جرم میں تھا کہ لاش کار سے نکال کر پھینک دی تھی۔ سیشن کورٹ نے اعجاز کو عمر قید کی سزا دی تھی۔ ہائی کورٹ نے اپیل میں شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔

پاپی کا پیار

خاوند نے اس لیے دوسری شادی کی کہ اولاد نہیں تھی دوسری بیوی نے اس لیے اسے قبول کیا کہ صاحبِ جائیداد تھا۔ ان کے درمیان ایک پاپی آ گیا جو پیار کا پیاسا تھا

انسان کی فطرت ایک عجوبہ ہے۔ اگر آپ پولیس کا ریکارڈ دیکھیں تو بعض وارداتوں کو آپ ناقابلِ یقین تصور کریں گے اور کہیں گے کہ کوئی انسان یہ حرکت نہیں کر سکتا۔ روپے پیسے اور جائیداد کا لالچ، عورت کی محبت، حسد اور رقابت کا جذبہ بعض انسانوں پر جن کی طرح سوار ہو جاتا ہے اور ان سے ایسی حرکتیں کرا لیتا ہے جو ہوش والے انسانوں کے لیے ناقابلِ یقین ہوتی ہیں بلکہ ایسی حرکت کرنے والا انسان خود بھی جب پکڑا جاتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ اس نے یہ واردات کی تھی۔ پھر اسے بچاؤ کی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اقبالِ جرم کر لیتا ہے۔ یہ واردات جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں ایسی ہی وارداتوں میں سے ایک ہے۔

شام کے چار بج رہے تھے۔ عابد نام کا ایک آدمی، عمر پینتیس سال سے ذرا زیادہ، تھانے میں آیا۔ رپورٹ درج کرائی کہ اس کی بچی جس کی عمر تین مہینے ہے، گم ہو گئی ہے گمشدگی ایک بجے کے لگ بھگ ہوئی ہے۔ گھر میں بچی کی ماں تھی اور نانی۔ بچی کا باپ جو رپورٹ دینے آیا تھا بسلسلۂ کاروبار گھر سے باہر تھا۔ تین بجے اسے اطلاع پہنچی کہ بچی کو

کوئی اٹھا لے گیا ہے۔ وہ گھر آیا اور یقین کر کے کہ بچی کو کوئی پڑوسی عورت یا کوئی بچہ پیار سے نہیں اٹھا لے گیا، تھانے میں رپورٹ دینے آ گیا۔

میں عابد کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ بڑا اچھا مکان تھا جو ایک محلے میں واقع تھا۔ عابد کا کاروبار اچھا تھا۔ اس کے دو مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ گھر میں عابد اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے والدین مر چکے تھے۔ گھر میں ایک نوکرانی تھی جس کے خلاف شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیوں کہ بچی کی ماں کے بیان کے مطابق وہ صبح دس بجے کے قریب کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور بچی کی گمشدگی کے نصف گھنٹہ بعد آئی تھی۔ عابد چونکہ گھر نہیں تھا اس لیے ابتدائی معلومات عابد کی بیوی سے لینی تھیں۔ میں نے عابد اور اس کی ساس کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ عابد کی بیوی جس کا نام فرزانہ تھا، کو اس کمرے میں لے گیا جہاں بچی سوئی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں قیمتی فرنیچر تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ عابد کا کاروبار بہت اچھا ہے۔ میں نے فرزانہ میں پہلی چیز یہ نوٹ کی کہ اس کی عمر بیس سال ہے۔ عابد کی عمر پینتیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ دوسری چیز یہ نوٹ کی کہ آنکھیں صاف شفاف تھیں۔ میں نے ان آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا، ان میں آنسوؤں کا کوئی نشان نہ تھا۔ سُرمہ موجود تھا۔ چہرہ جوانی کے جوش سے دمک رہا تھا۔ اس پر مجھے افسوس اور غم کا کوئی کھرا کھوج نہ ملا۔ اس نے گہرا میک اپ کر رکھا تھا جس کی اسے ضرورت نہیں تھی کیونکہ خدا نے اسے گورا رنگ دیا تھا۔ اُن دنوں بالوں کا فیشن کچھ اور تھا۔ فرزانہ نے اس فیشن میں یہ اضافہ کیا ہوا تھا کہ کانوں کے قریب سے بال کاٹ کر لمبی قلمیں بنائی ہوئی تھیں۔ لباس شوخ رنگ کا تھا۔

میں نے جب اسے کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ اس کمرے میں چلیں جہاں سے بچی گم ہوئی

ہے تو وہ بیس سال کی پردہ نشین لڑکیوں کی طرح شرمائی یا جھینپی نہیں بلکہ فوجیوں کی طرح چٹاخ پٹاخ چلتی میرے آگے آگے کمرے میں چلی گئی اور بولی ۔ "آیئے"۔

ایک تو کوٹھیوں میں رہنے والے لوگ ہوتے ہیں جن میں عجیب طرح کی شو بازی ہوتی ہے اور ایک گنجان اور پرانے محلوں میں رہنے والی ایک خاص کلاس ہوتی ہے جس کی تعلیم کم، سوسائٹی ان پڑھ اور کاروبار سے آمدنی بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں مضحکہ خیز قسم کی شو بازی ہوتی ہے۔ اس کلاس کی لڑکیاں بھانڈوں کی سی حرکتیں کرتی ہیں۔ یہی حال اس لڑکی کا تھا۔ وہ مجھ پر رعب گانٹھ رہی تھی کہ ہم پیسے والے ہیں اور میں "ایڈوانس" لڑکی ہوں۔ پھر بھی میں نے اس کے متعلق کوئی بری رائے قائم نہ کی۔ میں نے سوچا کہ بیس سال عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ ابھی اس کا ذہن کچا ہے۔ مجھے یہ جتانا چاہتی ہے کہ تم تھانیدار ہو تو کیا ہوا۔ میں بڑے امیر آدمی کی بیوی ہوں ۔۔۔ میں نے کمرے میں جا کر پوچھا کہ بچی کہاں تھی؟ اس نے دیوان پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔۔ "سو گئی تھی۔ میں اسے یہاں ڈال گئی تھی"
میں نے دیوان کو بڑی غور سے دیکھا۔ کمرے کے دروازوں کا جائزہ لیا۔ ایک اندر کھلتا تھا۔ ایک دوسرے کمرے میں اور اس کے بالمقابل ایک اور دروازہ تھا جو ڈیوڑھی میں کھلتا تھا اور ڈیوڑھی کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا جو فرزانہ کے بیان کے مطابق دن کے وقت کھلا رہتا اور رات کو بند ہوتا تھا۔

بیویاں دو تھیں

فرزانہ نے بیان دیا کہ صبح سے اس کی ماں آئی ہوئی تھی۔ فرزانہ کے ماں باپ اس شہر کے دور دراز محلے میں رہتے تھے۔ گیارہ بجے صبح فرزانہ نے بچی کو دودھ پلایا

اور وہ سو گئی۔ اس نے بچی کو دیوان پر ڈال دیا اور ماں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ایک بجے کے بعد بچی کا خیال آیا کہ جاگ اٹھی ہو گی۔ جا کے دیکھا۔ بچی غائب تھی۔ ڈیوڑھی کی طرف کھلنے والا دروازہ کھلا تھا۔ نوکرانی گیارہ بجے سے پہلے گھر چلی گئی تھی۔ فرزانہ ماں کو بتائے بغیر پڑوس کے تین گھروں میں گئی۔ وہاں کی عورتیں اور ایک گھر کی ایک لڑکی بچی سے بہت پیار کرتی تھیں۔ فرزانہ اس خیال سے وہاں گئی کہ شاید مذاق سے کوئی بچی کو اٹھا لے گئی ہو۔ ان میں سے کسی نے ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ ایک گھر سے اسے پتہ چلا کہ فرزانہ کے خاوند کی پہلی بیوی اس کے ہاں آئی تھی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ فرزانہ نے کہا ”مجھے اس پر شک ہے“ ۔۔۔ یہ میرے لیے نیا انکشاف تھا کہ عابد کی ایک اور بیوی بھی ہے۔ میں نے فرزانہ سے پوچھا کہ اسے اس بیوی پر جس کا نام جمیلہ تھا، کیوں شک ہے؟

اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ بارہ سال ہوئے عابد نے جمیلہ کے ساتھ شادی کی تھی لیکن کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دس سال گزر گئے تو اولاد کی کوئی امید ہی نہ رہی۔ عابد بیوی کا علاج کراتے کراتے مایوس ہو گیا تو اس نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا۔ جائیداد خاصی تھی۔ اس کا کوئی وارث تو ہونا چاہیے تھا۔ جمیلہ کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس نے عابد کی منت سماجت کی کہ دوسری شادی نہ کرے۔ عابد نہ مانا۔ اس نے فرزانہ کے ماں باپ سے رشتہ مانگا۔ رشتہ مل گیا اور شادی ہو گئی۔ اب عابد اور فرزانہ کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے۔ دوسرے سال کے آخر میں یہ بچی پیدا ہوئی جو گم ہو گئی۔

فرزانہ نے بتایا کہ جب وہ اس گھر میں آئی تو جمیلہ نے اسے کہا تھا کہ اس گھر میں کبھی بچہ پیدا نہیں ہو گا اور اگر تم نے بچے کو جنم دیا تو وہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔ خاوند

جمیلہ کو اپنے گھر رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ میکے چلی جاتی تھی اور یہاں ہفتے میں ایک دو دن ہی رہتی تھی۔ اس دو سال کے عرصے میں جمیلہ نے فرزانہ کے کہنے کے مطابق اسے کئی بار دھمکی دی کہ اگر تم نے بچے کو جنم دینا ہے تو اسے اپنے میکے میں رکھنا۔ وہ یہاں نہیں رہ سکے گا ـــ اب بچی لاپتہ ہو گئی اور فرزانہ پڑوس کے تین گھروں میں گئی تو ایک گھر سے اسے پتہ چلا کہ جمیلہ آئی تھی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر فرزانہ نے بتایا کہ جب سے بچی پیدا ہوئی ہے جمیلہ یہاں دو بار آئی ہے۔ دونوں بار ایک ایک رات یہاں رہ کر چلی گئی تھی۔ خاوند کے ساتھ کبھی کبھی رہتی تھی۔ خاوند اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

میں نے بہت سے سوال اپنے ذہن میں محفوظ رکھ لیے اور اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو تیسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہ سوتے کا کمرہ تھا میں نے اسے غور سے دیکھا۔ دونوں پلنگوں کو دیکھا۔ میں جس چیز کی تلاش میں تھا وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ چیزیں بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ میں نے فرزانہ سے کہا کہ وہ اس عورت کو بلا لائے جس کے پاس جمیلہ آج آئی تھی۔ میں نے اتنی دیر کے لیے عابد کو الگ کمرے میں بٹھا لیا۔ میں نے پہلا سوال یہ پوچھا ـــ "کیا آپ کو اپنی پہلی بیوی پر شک ہے کہ وہ بچی کو اٹھا کر لے گئی ہو گی؟" ـــ عابد نے سر جھکا لیا اور خاصی دیر کچھ سوچتا رہا۔ جب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو میں نے کہا ـــ "آپ اور زیادہ وقت صرف کریں لیکن جواب سوچ کر دیں۔ بہت بڑا جرم ہوا ہے۔ آپ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ آپ کے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن کہ آپ کے الفاظ مجھے گمراہ کر دیں اور آپ کو اپنی بچی کبھی نہ ملے۔ کہیئے، آپ کو اپنی پہلی بیوی پر شک ہے؟"

"فرزانہ نے اس پر شک کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ آپ فرزانہ سے پوچھیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔"

"ہو سکتا ہے اس نے انتقام کے طور پر بچی کو غائب کیا ہو۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس پر شک ہے۔"

"آپ نے جمیلہ کے ساتھ دس سال گزارے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ اس میں اتنا بڑا جرم کرنے کی ہمت ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ شریف گھرانے کی عورت ہے۔"

"اولاد نہ ہونے کی وجہ کیا تھی؟"

"جمیلہ میں نقص تھا۔" عابد نے جواب دیا۔ "میں نے مجبور ہو کر یہ دوسری شادی کی تھی۔"

"آپ نے جمیلہ کا علاج کرایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "اگر کرایا ہے تو ڈاکٹر کون سا تھا؟"

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔" اس نے جواب دیا۔ "دس برس میں کوئی ڈاکٹر، حکیم وید، سنیاسی اور سیانا نہیں چھوڑا۔"

"دوسری شادی کے بعد جمیلہ کا رویہ کیا تھا؟"

"آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسے بہت صدمہ ہوا تھا۔" عابد نے جواب دیا۔ "وہ زیادہ دن اپنے ماں باپ کے گھر رہتی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ بالکل ہی خاموش رہنے لگی تھی۔"

"جمیلہ اور فرزانہ کا کبھی لڑائی جھگڑا بھی ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور فرزانہ نے کبھی آپ کو یہ کہا ہے کہ جمیلہ کو طلاق دے دیں یا اس نے کبھی اس کے خلاف کوئی شکایت کی ہے؟"

"یہ تو روز ہی ہوتا ہے کہ فرزانہ جمیلہ کے خلاف کوئی نہ کوئی شکایت میرے آگے رکھ

دیتی ہے۔" عابد نے جواب دیا ۔۔۔ "اور جب فرزانہ کی ماں یہاں آتی ہے تو جمیلہ کے

خلاف باتوں کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتی۔ ایک بار اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

میں جمیلہ کے ہاتھ کا پانی بھی نہ پیا کروں۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ بچّی کی گمشدگی

کچھ روز پہلے فرزانہ کی ماں میرے ہاں ہر روز آجاتی تھی اور مجھے جمیلہ کے متعلق پہلے سے

زیادہ بھڑکانے لگی تھی۔ کہتی تھی کہ جمیلہ انہیں دھمکیاں دیتی ہے اور اس کے رویّے سے

پتہ چلتا ہے کہ ضرور کوئی وار کرے گی۔ پھر بچی غائب ہو گئی۔"

فرزانہ کی ماں بھی وہیں تھی۔ اسے میں نے اپنے پاس بٹھایا تو اس نے مجھے کوئی سوال

کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ جمیلہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور یہ بھی کہا ۔۔۔ "عابد کو سو بار کہہ

چکی ہوں کہ اس ڈائن کو طلاق دے دے۔ کہیں ایسا نہ کہ تجھے یا میری بیٹی کو لے بیٹھے۔ یہ لڑکا نہیں

مانا اور آج نتیجہ دیکھ لو۔ مجھے سولہ آنے یقین ہے کہ بچّی کو وہی اٹھا کے لے گئی ہے

محلے میں آئی تھی۔ کیا لینے آئی تھی؟"

"آپ تجربہ کار عورت ہیں۔" میں نے اسے کہا۔ "وہ بچی کو لے جا کر کرے گی کیا؟ آپ

کا دماغ کیا کہتا ہے؟"

"وہ بڑی چالاک عورت ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اللہ جانے کیا کرے گی۔ اسے

کر کہیں دبا دے گی۔ حسد ہے نا۔ وہ اتنی جل گئی ہے کہ بچّی کو ہی غائب کر دیا ہے"

وہ عورت میرے انتظار میں بیٹھی تھی جس کے ہاں جمیلہ آئی تھی۔ میں نے اسے

اپنے پاس بلایا۔ سیدھی سادی شریف سی عورت تھی۔ اس کے منہ سے بات بھی نہیں

نکل رہی تھی۔ میں نے تسلی دی۔ حوصلہ بڑھایا تو اس نے کچھ باتیں کیں۔ اس سے

چلا کہ جمیلہ اس کے گھر آئی رہتی۔ عورتوں نے کمیٹی ڈالی تھی۔ وہ اسی سلسلے میں آئی تھی۔ فرزانہ کے متعلق بھی باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے بہت کریدا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوئی۔ یہ پتہ چلا کہ اس نے فرزانہ کے خلاف شدید غصے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ روئی ضرور تھی اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ عابد سے طلاق لینا چاہتی ہے لیکن عابد نہیں مانتا۔ اس نے اعتراف بھی کیا تھا کہ عابد کے دل میں اس کی محبت ہے۔ میں نے اس عورت سے پوچھا "تمہارے گھر سے اٹھ کر جمیلہ کہاں گئی تھی؟" —— اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ اندر بیٹھی رہی تھی اور جمیلہ نکل گئی تھی۔

پولیس میں تفتیش اور سراغ رسانی کی ٹریننگ اسی طرح دی جاتی ہے جس طرح فوج میں فوجی ٹریننگ لیکن جنگ میں بعض اوقات اس ٹریننگ کو نظر انداز کر کے ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن کا ذکر کسی سرکاری کتاب میں نہیں آتا۔ اسی طرح تفتیش کے دوران بھی ایسے ایسے موقعے آجاتے ہیں کہ اپنی عقل سے کام لینا پڑتا ہے۔ تفتیش میں بعض حالتوں میں ہم بولنے والے کی باتوں کی طرف اتنا دھیان نہیں دیتے جتنا اس کے چہرے کو دیکھتے ہیں کہ اس پر کیسے کیسے رنگ آتے ہیں اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں کس طرح پھرتی ہیں۔ یہ فہم و فراست اور انسان شناسی کا کھیل ہوتا ہے۔ اگر آپ میں عقل ہے تو آپ جیت گئے ورنہ ملزم جیت گیا —— اس بچی کی گمشدگی کی تفتیش میں مجھے اپنی عقل سے زیادہ کام لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ان تمام افراد پر جن کا اوپر ذکر کر چکا ہوں کوئی جرح نہ کی اور نہ ہی انہیں یہ تاثر دیا کہ میں اس کے بعد بھی ان کے بیان لوں گا۔ انہیں بالکل شک نہیں ہوا کہ یہ تو ابتدائی کارروائی ہے اور یہ محض ایک تعارفی رسم ہے۔

میں عورتوں سے الگ عابد کے ساتھ بیٹھ گیا ـــــ نوکرانی چائے لے آئی۔ وہ ٹرے میں سے پیالیاں اٹھا کر تپائی پر رکھ رہی تھی تو اچانک میرے دماغ میں ایک سوال آیا جو میں نے نوکرانی کی موجودگی میں عابد سے پوچھا ـــــ "کھانا کون پکاتا ہے" نوکرانی نے جواب دیا ـــــ "میں پکاتی ہوں" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "آج کس نے پکایا تھا؟" ـــــ عابد نے کہا ـــــ "میں تو صبح ہی نکل گیا تھا۔ اسی نے پکایا ہوگا" ـــــ نوکرانی نے کہا ـــــ "میں خود پکا کر گئی تھی" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کتنے بجے؟" ـــــ اس نے کہا ـــــ "بارہ بج گئے تھے جب میں گھر سے نکلی تھی"۔

چائے کے دوران عابد کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں جنہیں میں نے گپ شپ کا رنگ دیئے رکھا مگر عابد کا ہر لفظ ذہن میں محفوظ کرتا گیا۔ اس پر خاص قسم کی گھبراہٹ طاری تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ چکرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جمیلہ کو وہ طلاق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ فرزانہ کو وہ پسند کرتا تھا۔ وہ آخر خوبصورت اور جوان لڑکی تھی لیکن عابد کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اولاد کی خاطر یہ تجربہ کیا ہے اور اب اس تجربے سے پریشان ہے۔ بعض باتیں تو بالکل ہی اُکھڑی اُکھڑی کرتا تھا۔ فرزانہ کی ماں کے متعلق اس کی رائے اچھی نہیں تھی۔ اس نے کھُل کر کوئی الزام نہیں لگایا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اس عورت کو وہ اپنے گھر میں پسند نہیں کرتا۔ میں نے دانستہ کوئی سوال نہ کیا۔ میں ابھی بنیاد بنا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو پتہ چلنے دوں کہ میری بنیاد کیا ہے۔

میں جب وہاں سے اٹھا اور تھانے کی طرف چلا تو میرے سامنے دو راستے آئے۔

ایک یہ کہ فرزانہ نے بچی کو خود غائب کیا ہے جس کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ جمیلہ پر الزام عائد کر کے عابد کو اکسایا جائے کہ وہ جمیلہ کو طلاق دے دے۔ دوسرا یہ کہ جمیلہ نے بچی

غائب کی ہے جو حسد اور رقابت کی انتہا ہے۔ میں نے ایسی واردا تیں بھی دیکھی تھیں کہ بے اولاد عورتوں نے دوسری عورتوں کے دودھ پیتے بچوں کو جان سے مار دیا۔ یہ ماتا کے جذبے کی پیاس کا بڑا ہی خطرناک رخ ہوتا ہے۔ لیکن اس سوال نے مجھے پریشان کر دیا کہ بچی کو فرزانہ نے خود غائب کیا یا جمیلہ نے، تو مقصد حاصل کر کے کیا بچی خود ہی واپس آجائے گی یا قتل ہو چکی ہو گی؟ کیا ان دونوں میں سے جس نے بھی یہ جرم کیا ہے وہ اس قدر پختہ کار مجرم ہے کہ جرم کی آخری کڑی تک سکیم بنائی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ملزمہ کو کسی پختہ کار مرد یا مردوں کا تعاون حاصل ہے۔۔۔ اب جمیلہ کو دیکھ کر مجھے یہ رائے قائم کرنی تھی کہ آیا اس میں جرم کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ میں نے عابد سے جمیلہ کے گھر کا اتا پتا لے لیا تھا۔

جمیلہ کے گھر گیا تو اس کا باپ ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا۔۔۔ "یہ وقت بھی مجھے دیکھنا تھا کہ میرے دروازے پر پولیس کھڑی ہو گی"۔ وہ مجھے اندر لے گیا اور میری ٹھوڑی چھو کر پھر ہاتھ باندھ کر التجا کی۔۔۔ "مجھ پر ایک کرم کریں کہ میری بیٹی کو تھانے نہ بلائیں۔ میری ساری عمر کی کمائی صرف عزّت ہے۔ ان بدمعاش عورتوں نے میری بیٹی پر الزام عاید کیا ہے کہ وہ بچّی کو اٹھا لائی ہے"۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" میں نے پوچھا۔

"عابد بتا گیا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "دو گھنٹے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اس نے میرے سامنے جمیلہ کو کہا تھا کہ بچی گم ہو گئی ہے اور فرزانہ اور اس کی ماں جمیلہ پر شک کر رہی ہیں"۔

"کیا عابد کو بھی شک تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "اس نے آپ سے یا جمیلہ سے اس

قسم کی بات کہی تھی کہ وہ بچی واپس کر دے؟"

"بالکل نہیں"۔ اس نے کہا۔ "وہ صرف بتانے آیا تھا اور بہت پریشان تھا۔ جمیلہ اُس وقت سے رو رہی ہے اور پریشان ہے"۔

"عابد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

"اتنا سیدھا آدمی ہے کہ آپ اسے بدّھو کہہ سکتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "اس نے دوسری شادی جائیداد کا وارث پیدا کرنے کے لیے کی ہے مگر غلط لوگوں کی باتوں میں آ کر پھنس گیا"۔

"جائیداد کتنی ہے؟"

"تین مکان اور بازار میں دو دکانیں ہیں۔ بنک میں پیسہ بھی بہت ہے اور لاکھوں کا چالو کاروبار ہے"۔

طلاق کیوں نہ دی؟

یہ اکثر ہوتا ہے کہ تفتیش میں کسی کو شامل کریں تو وہ رو پڑتا ہے لیکن اس سے یہ رائے قائم کرنا کہ اس کا اس جرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں غلط ہوتا ہے۔ رونے رونے میں فرق ہوتا ہے اور اس فرق کو کوئی پولیس والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ جمیلہ کے باپ کے آنسو ایک شریف آدمی کے آنسو تھے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی عزت کا پورا پورا خیال رکھوں گا اور آئندہ اس کے گھر آنا پڑا تو وردی پہن کے نہیں آؤں گا اور رات کو نہیں آؤں گا۔ مسلمان جرم کرنے سے تو گھبراتے نہیں تھے، مجھ میں اتنی شرم موجود تھی کہ ان کی عورتوں کی عزت کا میں خاص خیال رکھتا تھا۔ یہ آدمی تو تھا ہی بھلا مانس۔ میں نے اسے

کہا جمیلہ کو میرے پاس بھیج دے اور کوئی فکر نہ کرے۔ جمیلہ آئی تو باپ بھی ساتھ آگیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ذرا باہر چلا جائے کیوں کہ مجھے کچھ ایسی باتیں بھی پوچھنی ہیں جو جمیلہ شاید اُس کے سامنے نہ بتائے۔ باپ باہر نکلا تو جمیلہ گھبرا گئی۔ وہ فرزانہ سے بالکل اُلٹ تھی۔ اس میں سادگی اور حیا تھی۔ فرزانہ بھی خوبصورت تھی لیکن میری رائے میں جمیلہ زیادہ خوبصورت تھی اور میں یہ کہتے ہوئے نہیں جھجکوں گا کہ فرزانہ کی خوبصورتی جنسی جذبات کو اُبھارتی تھی اور جمیلہ کی خوبصورتی میں جو کشش تھی اس میں پاکیزہ تاثر تھا۔ اس کا چہرہ اداس بلکہ بجھا ہوا تھا۔ آنکھیں بتاتی تھیں کہ جمیلہ بہت دیر روتی رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں فرزانہ کی آنکھیں شفاف تھیں۔ اگر میں ان دونوں کو اکٹھا کھڑا کر کے کسی سے پوچھتا کہ ان دونوں میں سے کس کی بچی گم ہوئی ہے تو وہ چہرہ اور آنکھیں دیکھ کر جمیلہ کی طرف اشارہ کرتا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں نے جمیلہ کے باپ کی شرافت کی تعریف کی اور اس کی پریشانی پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو جمیلہ کے اعصاب سے پولیس کا ڈر اُتر گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہ یقین لے کر نہیں آیا کہ بچی آپ نے اغوا کی ہے۔ میں یہ یقین کرنے آیا ہوں کہ آپ بے گناہ ہیں تاکہ میں اصل مجرم کو پکڑوں۔ اس طرح کی یقین دہانی سے وہ اطمینان سے بولنے پر آمادہ ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ نے کبھی عابد سے طلاق لینے کی سوچی ہے؟"

"میں اسے بہت دفعہ کہہ چکی ہوں مگر وہ نہیں مانتا" اس نے جواب دیا۔ "اس کے مجبور کرنے پر کبھی کبھی اس کے گھر چلی جاتی ہوں۔ اس کی خاطر رات کو بھی اسی کے پاس رہتی ہوں۔ صبح کو فرزانہ گھر میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر طوفان کھڑا کر دیتی ہے۔ عابد اپنے

کام پر چلا جاتا ہے اور میں یہاں آجاتی ہوں۔"

"اس نے کبھی فرزانہ کے خلاف بات کی ہے؟"

"کبھی نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں جب ماں باپ کے گھر ہوتی ہوں تو عابد شام کو گھر جانے سے پہلے روزانہ یہاں آتا ہے۔ میں نے اس کے سامنے فرزانہ کا کبھی نام نہیں لیا اس لیے وہ بھی اس کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا۔"

"آپ کو عابد اپنے گھر رکھنے کے لئے بھی کہتا رہا ہے؟"

"اس کی خواہش یہی تھی لیکن فرزانہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میں وہاں رہوں۔" اس نے کہا۔ "جب فرزانہ کے پیٹ میں یہ بچی تھی تو عابد کی یہ ضد پہلے سے زیادہ ہو گئی میں اس کے ساتھ رہوں۔ میرا خیال تھا کہ فرزانہ چونکہ اس حالت میں ہے۔ اس وہ مجھے گھر رکھنا چاہتا ہے لیکن گھر میں نوکرانی ہے اس لئے کام کاج کی تو کوئی تکلیف سچی بات یہ ہے کہ میں فرزانہ کی خدمت اور تیمارداری کے لیے تیار نہیں تھی۔ عابد کرتا رہا اور میں ٹالتی رہی۔ ایک روز عابد نے مجھے غصے سے کہا کہ جمیلہ، میرے گھ صرف تم آباد کرو گی۔ فرزانہ میرے گھر کی مالک نہیں بن سکتی ــــ میں نے اسے کہا کہ خدا تمہاری مراد پوری کی ہے۔ تمہاری جائیداد کا وارث آرہا ہے ــــ وہ ناراض ہو کر گیا۔ تین روز بعد آیا تو اس نے مجھے دو کاغذ دیئے۔ کہنے لگا کہ دو مکان، ایک دکان تمہا نام کر دی ہے۔ یہ رجسٹری کے کاغذات ہیں۔ میں نے یہ کاغذ ہاتھ میں لئے تو میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ دراصل جی بات یہ ہے کہ محلے برادری کے لوگ میری اور عابد کی محبت مثال دیا کرتے تھے۔" یہ کہتے ہوئے جمیلہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ کچھ دیر بعد سنبھلی تو کہنے لگی ــــ "عابد نے یہ غلط

کو بتادیا کہ اس نے دو مکان اور ایک دکان میرے نام رجسٹری کر دی ہے۔ میں عابد کے مجبور کرنے پر ایک روز اس کے گھر چلی گئی۔ رات کو ہم ایک ہی کمرے میں سوئے اور فرزانہ دوسرے کمرے میں اکیلی رہی۔ صبح عابد کام پر جانے لگا تو بڑا جذباتی ہو کر کہنے لگا کہ خدا کے لیے ایک رات اور یہیں گزار جاؤ۔ وہ کام پر چلا گیا اور میں رک گئی۔ فرزانہ مجھ پر برسنے لگی۔ کہنے لگی کہ عابد پر تیرا جادو چل گیا ہے۔ تو نے آدھی سے زیادہ جائیداد بھی اس سے لکھوا لی ہے اور مجھے بھی گھر سے نکلوانا چاہتی ہو.....

"میں نے اسے کہا کہ میں یہاں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رہنا چاہتی۔ میں تو اس سے طلاق مانگ رہی ہوں۔ تم ہی اسے کہو کہ مجھے طلاق دے دے۔ وہ بولی کہ وہ تجھے طلاق کیوں دے گا، وہ تو مجھے طلاق دینا پھر رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر روز لڑائی جھگڑا کھڑا کر دیتا ہے ___ اس وقت میں نے اسے وہ بات کہہ دی جو میں نہیں کہنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا کہ عابد نے تمہارے ساتھ اس لیے شادی کی تھی کہ تم اس کا بچہ جنو۔ اسے حرام کے بچے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو میں بھی جن سکتی تھی۔ صرف شرم اتارنے کی بات تھی۔ تم نے اتار دی، میں نہیں اتار سکی۔ پھر فرزانہ نے جو طوفان برپا کیا وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

بچی اپنے باپ کی نہیں!

جمیلہ کی بات سن کر میں چونک اٹھا اور پوچھا کہ حرام حلال کا کیا قصہ ہے؟ اس نے ایک انکشاف کر کے میرے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ جمیلہ نے کہا ___ "یہ بچی عابد کی نہیں ہو سکتی۔ چار سال تک ہماری کوئی اولاد نہ ہوئی تو عابد نے میرا علاج شروع کر دیا۔ ایک سال تک ہم نے بہت سے ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج کرائے۔ ایک ڈاکٹر نے عابد

کو اپنا معائنہ کرانے کے لیے کہا۔ معائنہ کرایا تو نقص عابد میں نکلا۔ اگلا ایک سال د
اپنا علاج کراتا رہا۔ وہ جسمانی لحاظ سے ٹھیک تھا۔ بظاہر اسے کوئی شکایت نہیں تھی
مگر اولاد نہ ہوئی۔ ایک ڈاکٹر نے دِلی کی ایک لیڈی ڈاکٹر اور دو ڈاکٹروں کے پتے دے
کر مشورہ دیا کہ وہ سپیشلسٹ ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی صحیح رائے نہیں دے سکے گا۔ ہم
دِلی چلے گئے۔ لیڈی ڈاکٹر نے میرا پورا معائنہ کیا اور بتایا کہ مجھ میں کوئی نقص نہیں۔ ہم
تین روز دِلی میں رہے۔ عابد نے ایک ڈاکٹر سے معائنہ کرایا۔ اس کے خون اور دوسری
چیزوں کا ٹیسٹ کیا گیا۔ ڈاکٹر نے لکھ دیا کہ قدرت نے اس کے خون میں اولاد پید
کرنے والے جراثیم پیدا ہی نہیں کیے۔ یہ قدرتی نقص ہے جس کا کوئی علاج نہیں
ہم دوسرے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اسے یہ نہیں بتایا کہ ہم ایک سپیشلسٹ سے معائ
کرا آئے ہیں۔ اس نے بھی پہلے ڈاکٹر کی طرح لیبارٹری میں معائنہ کیا اور لکھ د
کہ عابد کا خون اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دوائیوں کا کو
اثر نہیں ہو گا کیوں کہ یہ نقص پیدائشی ہے۔ عابد اداس ہو گیا۔ اس کے آنسو بھی نکل آ
تھے۔ لیکن وہ پھر اپنے آپ کو دھوکے دینے لگا۔ کہتا تھا کہ ڈاکٹر بکواس کرتے ہیں۔"

"آپ مجھے ان ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹر کے پتے بتا سکتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں پتے بھی بتا سکتی ہوں اور اتفاق سے تمام ڈاکٹروں کے نسخے اور ان دون
ڈاکٹروں کی اور لیڈی ڈاکٹر کی رپورٹیں میرے پاس محفوظ ہیں" ــــ وہ اندر گئی اور کاغذ
کا ایک پلندہ لے آئی جو اس نے نتھی کر رکھا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پڑھی لکھ
اور سلیقہ شعار عورت ہے۔ میں نے تمام نسخے دیکھے جو بہت سے ڈاکٹروں اور حکیمو
کے تھے اور اس میں دِلی والی لیڈی ڈاکٹر اور دونوں ڈاکٹروں کی رپورٹیں بھی تھیں

میں نے یہ رپورٹیں اپنے پاس رکھ لیں اور باقی کاغذات جمیلہ کو دے دیئے۔ جمیلہ نے کہا۔
"عابد نے یہ امید لگائے رکھی کہ اس کی اولاد ہو سکتی ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ یہ امید جھوٹی ہے۔
وہ اولاد کی خاطر ایسا دیوانہ ہو گیا کہ اس نے دوسری شادی کر لی۔"

"آپ نے اسے دوسری شادی سے روکا تھا؟"

"جی۔ میں نے روکا تھا۔ میں نے اسے محبت کے واسطے دیئے تھے اور میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہاری ہوئی بازی پر میری محبت کو داؤ پر لگا رہا ہے۔ مگر اس نے میری منّت کی کہ میں اسے قسمت آزمانے دوں۔ میں نے اسے کئی بار کہا کہ عابد تمہاری اولاد نہیں ہو گی۔ اپنے آپ کو دھوکے نہ دو۔ آخر اس نے شادی کر لی۔ وہ چالاک آدمی نہیں۔ میں اسے بچہ سمجھتی ہوں اور وہ جب میرے پاس ہوتا ہے تو اپنے آپ کو بچہ بنا لیتا ہے۔ یہ محض بچّوں کی ضد تھی کہ اس نے شادی کر لی۔ وہ یہ ضد بھی کرتا تھا کہ میں اس کا ساتھ نہ چھوڑوں لیکن میں اپنے دل پر پتھر نہ رکھ سکی۔ میں نے اس کی ضد پوری کرنے کی کوشش کی تھی مگر فرزانہ نے اس گھر میں میرے وجود کو برداشت نہ کیا۔ میں ماں باپ کے گھر رہنے لگی۔ یہ تو آپ کو بتا چکی ہوں کہ عابد ہر روز میرے پاس آتا رہا اور ایک روز اس نے یہ خبر سنائی کہ فرزانہ کی گود ہری ہونے والی ہے۔ اس کے بعد خوش ہونے کی بجائے اس نے یہ ضد اور تیز کر دی کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ فرزانہ کے ساتھ اس کی ان بن ہو گئی ہے۔ وہ پہلے میکے جاتی تھی۔ اب نہیں جاتی بلکہ اس کی ماں آ جاتی ہے اور کئی کئی روز وہیں رہتی ہے۔ عابد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فرزانہ اور اس کی ماں اس کے آگے بچھ بچھ جاتی ہیں۔ وہ کسی بات پر ناراض ہو تو زرخرید لونڈیوں کی طرح اس کی مٹھی چاپی کرتی ہیں۔ عابد اتنا سیدھا ہے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور وہ ان کے جال

میں پھنس جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چکی میں پس رہا ہے۔ اسی لیے مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔"

"آپ کا خیال ہے کہ یہ بچی عابد کی نہیں؟"

"اگر معجزہ ہو گیا ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اگر نہیں تو یہ بچی عابد کی نہیں ہو سکتی عابد مجھے اپنے ہاں رکھنے پر اس لیے زور دے رہا تھا کہ اسے فرزانہ کے چال چلن پر شبہ ہو گیا تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتی کہ بچی پیدا ہونے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور ثبوت بھی ہے یا نہیں۔ اس نے مجھے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ اسے فرزانہ کا چال چلن اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ یہ شک مجھے ہوا ہے۔"

اولاد کیوں نہ ہوئی؟

میں نے جمیلہ پر بھی کوئی جرح نہ کی۔ اس کے بیان نے مجھے تفتیش کا ایک واضح راستہ بتا دیا تھا لیکن اس کے بیان کو سچ مان لینا بھی دانشمندی نہیں تھی۔ ویسے جمیلہ نے مجھے متاثر ضرور کر دیا تھا۔ میں نے اس کے باپ کو بلایا اور اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور میں نے اسے یہ بھی کہا کہ جمیلہ کی باتیں اگر صحیح ثابت ہوئیں تو یہ اس کے حق میں بہتر نتیجہ برآمد کریں گی اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری پریشانی ختم ہو جائے۔۔۔ میں نے وقت دیکھا۔ شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ دِلی جانے والی گاڑی میں ایک گھنٹہ اور کچھ منٹ باقی تھے۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بچی کی برآمدگی سب سے پہلا کام تھا۔ لیکن سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکی لے کون گیا ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں پولیس انسپکٹر کو قیافہ شناس، جوتشی اور نجومی بننا پڑتا ہے۔ مجرم کا کوئی سراغ نہیں

تھا۔ موقعہ واردات شیشے کی طرح صاف تھا۔ اب تو مجھے بچی کے لواحقین کے دلوں میں سے بھید نکالنے تھے۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ بچی قتل کر دی جائے گی اور یہ خیال بھی آتا تھا کہ قتل کی جا چکی ہو گی۔

جمیلہ میں ایسے سنگین جرم کی صلاحیت نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے تھانے میں جا کر مخبروں کی فوج کو بلایا اور دلی جانے کی تیاری بھی کرنے لگا۔ روانگی سے پہلے دو آدمی آ گئے۔ انہیں عابد کے گھر، فرزانہ کے ماں باپ کے گھر اور جمیلہ کے گھر کی نگرانی کرنے اور تینوں گھروں کے مردوں کے متعلق رپورٹ دینے کو کہا۔ میں چونکہ دلی جا رہا تھا، اس لیے اپنے اے ایس آئی بشمبر ناتھ کو بتایا کہ وہ باقی مخبروں کی کیا کیا ڈیوٹی لگائے۔ میں ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ پسنجر ٹرین نے صبح پانچ بجے دلی پہنچایا۔ وہاں وقت گزارنے کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور ایک دوست کے کوارٹر میں جا کر سو گیا۔ دس بجے آنکھ کھلی تو تیار ہو کر اُس لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچا جس نے جمیلہ کا معائنہ کیا تھا۔ اسے جمیلہ کی رپورٹ دکھائی۔ اس نے پرانا ریکارڈ دیکھا اور رجسٹر سے دیکھ کر اس نے مریضوں کے کارڈ دیکھے اور جمیلہ کا کارڈ نکال لیا۔ یہ اینگلو انڈین لیڈی ڈاکٹر مسز فرانسس تھی۔ اُس زمانے میں مریضوں کی آج والی بھرمار نہیں ہوتی تھی۔ پانچ چھ سال پرانا ریکارڈ ڈھونڈتے اسے دیر نہ لگی۔ اس نے ذہن پر زور دے کر جواب دیا ۔۔۔ "یہ رپورٹ میری لکھی ہوئی ہے اور یہ بالکل صحیح رپورٹ ہے۔"

پھر دونوں ڈاکٹروں کے پاس باری باری گیا۔ دونوں ہندو تھے۔ انہیں عابد کی رپورٹیں دکھائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ آدمی اولاد پیدا نہیں کر سکتا اور اس نقص کا کوئی علاج نہیں۔ دونوں کے پاس اپنے لیبارٹری ٹیسٹوں کی ٹائپ شدہ رپورٹوں کی کاربن کاپیاں

موجود تھیں۔ میں انہیں بتا چکا تھا کہ میں پولیس آفیسر ہوں اور ضرورت پڑی تو انہیں کورٹ میں آنا پڑے گا۔ دونوں گواہی دینے پر آمادہ تھے۔ میں اسی روز دلّی سے واپس اپنے تھانے چلا گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ اب میں یہ لائن اختیار کرنا چاہتا تھا کہ بچی کو فرزانہ نے خود غائب کیا ہے اور الزام جمیلہ پر عائد کیا ہے تاکہ عابد جمیلہ سے بدظن ہو جائے لیکن میرا دماغ اس اس سوال پر آکر جکڑا جاتا تھا کہ کیا ماں اپنی دودھ پیتی بچی کو غائب کر سکتی ہے؟ اس سوال پر آکر میں یہ سوچنے لگتا کہ یہ ڈرامہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ فرزانہ بچی کو زندہ یا مردہ جمیلہ کے گھر سے برآمد کرا دے اور ایسی شہادت مہیا کرے کہ جمیلہ کا جرم ثابت ہو جائے۔ اس کے لیے کسی بڑے ہی قابل اور جرم کے ماہر دماغ کی ضرورت تھی۔ اب مجھے ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے تھے:

○ عابد کی نوکرانی نے کہا تھا کہ وہ کھانا پکا کر بارہ بجے گھر سے نکلی تھی لیکن فرزانہ نے کہا تھا کہ نوکرانی دس بجے چلی گئی تھی تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ نوکرانی ایک بجے کے قریب گئی ہو اور فرزانہ کے ایماء پر بچی کو ساتھ لے گئی ہو؟

● عابد نے کہا تھا کہ اولاد پیدا نہ کرنے کا نقص جمیلہ میں ہے۔ اس نے سپیشلسٹ ڈاکٹروں کی رپورٹیں مجھ سے کیوں چھپائیں؟

○ کیا عابد کے پاس بچی کی پیدائش کے علاوہ کوئی اور ثبوت ہے کہ فرزانہ کا چال چلن اچھا نہیں؟

میں نے عابد کے گھر جا کر وہ دیوان دیکھا تھا جس پر سوئی ہوئی بچی کو ڈالا گیا تھا۔ میں ایک چیز دیکھنے کے لیے مختلف کمروں میں گیا تھا۔ مجھے وہ چیز نظر نہیں آئی تھی۔ صبح دس بجے کے قریب میں پھر عابد کے گھر چلا گیا۔ فرزانہ کا میک اپ گہرا اور تازہ تھا۔ اس کی مار

بھی وہیں تھی۔ عابد اپنے کام پر جا چکا تھا۔ میں نے فرزانہ اور اس کی ماں کو الگ کمرے میں بٹھا لیا۔ دونوں کی آنکھوں کو دیکھا۔ آنکھیں صاف تھیں۔ میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "بڑی ٹھنڈ ہے۔ پہلے مجھے چائے پلایئے"۔۔۔ میں نے دوستانہ اور ہمدردانہ باتیں شروع کر دیں۔ فرزانہ نے نوکرانی کو چائے کے لیے کہہ دیا۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں کل جمیلہ کے ہاں گیا تھا۔ بڑی خطرناک عورت ہے، آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے بچی بردار کیا ہے۔ عابد کو ہی نہیں لے بیٹھی۔۔۔ فرزانہ! تمہارے مقابلے میں جمیلہ تو نوکرانی لگتی ہے۔ عابد کو چاہیئے کہ اسے فوراً طلاق دے دے"۔

ماں بیٹی نے اکٹھا ہی بولنا شروع کر دیا۔ جمیلہ کے خلاف وہ زہر اگلا کہ میں بھی حیران رہ گیا۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ لیا کہ عابد سے جمیلہ کو طلاق کس طرح دلائی جائے۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھنے لگیں۔ میں مخلص دوست کی طرح انہیں مشورے دیتا رہا۔ ماں نے پوچھا کہ جو جائیداد عابد جمیلہ کے نام کر چکا ہے، وہ کس طرح واپس ہو سکتی ہے؟ میں نے اس مسئلے کا بے معنی سا حل پیش کر دیا اور جمیلہ کے خلاف بھی کچھ باتیں کیں۔ چائے آئی، ہم پیتے رہے۔ ماں معلوم نہیں کیوں (یا شاید دانستہ) باہر نکل گئی۔ فرزانہ صوفے پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور بڑی بے تکلفی سے ایک ہاتھ میرے زانو پر رکھ کر اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر بولی۔۔۔ "آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ جمیلہ کو طلاق دلا دیں"۔

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔۔۔ "یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں"۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔ اس وقت اس کی مسکراہٹ کوئی اور ہی قسم کی تھی۔ کوئی مرد اس مسکراہٹ کو ٹال نہیں سکتا۔ اس نے میرا ہاتھ دبایا اور کہا۔۔۔ "آپ کی ہر فرمائش پوری کروں گی"۔

میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ مجرم بالکل کچے تھے اور یہ تو آپ نے بھی نوٹ کیا ہوگا کہ فرزانہ اور

اس کی ماں نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ ان کی بچی برآمد کی جائے۔ ان پر عابد کی جائیداد اور جمیلہ کے خلاف حسد اس حد تک سوار تھا کہ میں نے جھوٹی دوستی اور بے تکلفی کا اظہار کیا تو وہ تمام پردے اٹھا کر میرے سامنے آگئیں۔ اس کے باوجود مجھے یہ یقین کرنا تھا کہ انہوں نے بچی خود غائب کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بچی کو کوئی بردہ فروش یا کوئی اور پیشہ ور مجرم اٹھا لے گیا ہو اور ان ماں بیٹی نے جمیلہ پر شک کیا ہو یا جمیلہ کو اس میں ملوث کرنے کی سکیم بنا لی ہو۔

اس شک کے پیش نظر مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ چیزیں دیکھوں جو میں نے پہلے دن دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن نظر نہیں آئی تھیں۔ میں نے فرزانہ سے کہا ۔"اتنی زیادہ ٹھنڈ میں آپ نے بچی کے نیچے گدا بچھائے بغیر دیوان پر ڈال دیا تھا؟" دیوان پر گدا بچھانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میرا بھی ایک دودھ پیتا بچہ تھا۔ اتنے چھوٹے بچے کے نیچے چھوٹا سا گدا ضرور بچھایا جاتا ہے اور اکثر مائیں بچے کے پہلوؤں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گول تکیے ضرور رکھتی ہیں۔ مجھے گدے اور تکیوں کا خیال آیا تو میرا ذہن نہ میں اٹک گیا۔

میرا سوال سن کر فرزانہ ذرا سی گھبرائی پھر کہنے لگی ۔"میں نے کمبل میں لپیٹ کر ڈال دی تھی"۔ میں نے کہا ۔"آپ کی پہلی بچی ہے۔ آپ نے تو اس کے لیے بڑا خوبصورت گدا بنایا ہوگا؟" ۔ میں نے سوال دوستانہ لہجے میں کیا۔ اس نے کہا ۔"بہت خوبصورت!"

میں نے کہا ۔"دکھائیے ذرا، مجھے بھی اپنے بچے کے لئے خوبصورت سا گدا بنوانا ہے"۔

فرزانہ کی گھبراہٹ نمایاں ہوگئی۔ اس نے مجھے ٹالنے کے لیے کوئی اور ہی بات شروع کر دی۔ فرزانہ کی ماں جو کمرے سے نکل گئی تھی، واپس آگئی۔ اس وقت میرے ذہن میں

ایک اور سوال آ گیا جو میں نے داغ دیا۔ میں نے پوچھا "آپ کو دودھ پریشان کرتا ہو گا"۔ میں نے سوچا تھا کہ جوان اور تندرست لڑکی ہے، اس کا دودھ زیادہ اترتا ہو گا اور یہ بہت پریشان ہوتی ہو گی۔ فرزانہ کی بجائے اس کی ماں نے جواب دیا "دودھ تو بوتل سے پلاتے ہیں"۔ میں نے پوچھا کہ اپنا کیوں نہیں پلاتی؟ ماں نے مسکرا کر جواب دیا "اسے شروع میں ہی ایک دوائی دے کر دودھ خشک کرا دیا تھا۔ ابھی یہ بھی تو بچی ہی ہے۔ اسی عمر میں اپنا دودھ پلانے لگی تو جسم بھدّا ہو جائے گا۔ کمزوری بھی ہو جاتی ہے"۔

مجھے معلوم تھا کہ اکثر امیر زادیاں بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں بلکہ دوائیوں سے دودھ خشک کرا دیتی ہیں تاکہ جسم خراب نہ ہو۔ فرزانہ کی ماں کا جواب سن کر میں نے اچانک یہ سوال کیا "بوتل کہاں ہے؟"۔ ماں بیٹی نے بیک وقت ایک دوسری کی طرف دیکھا اور میں نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ میں نے گدّے اور بوتل کا تیر ہوا میں چلایا تھا۔ وہ نشانے پر بیٹھا۔ ماں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا "وہ تو ٹوٹ گئی تھی"۔ میں نے پوچھا "کب؟"۔ فرزانہ اور اس کی ماں نے ایک ہی وقت جواب دیا لیکن جواب دو تھے۔ ماں نے کہا "کل" اور بیٹی نے کہا "پرسوں"۔

اِک مورکھ بالک

میں نے ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں نے یہ سوال تفتیش کے سلسلے میں کیے ہیں۔ میں ظاہری طور پر ذاتی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہاں سے میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور دروازے میں ہی رک گیا۔ فرزانہ نے ہنس کر کہا "آ جاؤ۔ آ جاؤ۔ تھانیدار صاحب بہت اچھے آدمی ہیں"۔ اندر آ کر اس

نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ خوبصورت نوجوان تھا اور اس کی خوبصورتی مردانہ نہیں بلکہ زنانہ تھی۔ میں نے اُس وقت یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ فرزانہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ فرزانہ نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ۔۔۔ "اس کا نام تجمل ہے۔ اس کے والدین بچپن میں مر گئے تھے۔ اسے میری خالہ نے پالا ہے۔ بہت پیارا لڑکا ہے۔ آپ اس کا گانا سنیں تو سہگل اور کانن بالا کو بھول جائیں۔"

اُن دنوں مرد گویوں میں سہگل اور عورتوں میں کانن بالا کی آوازیں بہت مشہور تھیں۔ میں نے گانا سننے پر آمادگی ظاہر کی تو فرزانہ نے اسے گانا سنانے کو کہا۔ اس نے سہگل کا گایا ہوا ایک بڑا ہی اداس گیت شروع کر دیا۔ گیت کی اداسی کے ساتھ اس نوجوان لڑکے کی آواز کے سوز نے میرے جذبات کو بھی ہلا ڈالا۔ گیت کے الفاظ کچھ اس طرح تھے کہ ایک بچہ ریت کا گھروندا بناتا ہے اور اسے توڑ دیتا ہے۔ ایک دکھیارا انسان خدا سے کہتا ہے کہ وہ تو مورکھ بالک ہے۔ خود ہی بناتا اور خود ہی توڑ دیتا ہے تُو تو خدا ہے۔ تیری شان یہ تو نہیں کہ بچے کی طرح خود ہی بنائے اور خود ہی بگاڑے۔

گیت کے آخری مصرعے پر تجمل کے آنسو نکل آئے۔ وہ یتیم لڑکا تھا۔ میں اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ گیت کے الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے تھے ۔۔۔ گانے کے دوران فرزانہ کو میں نے دیکھا۔ وہ جن نظروں سے تجمل کو دیکھ رہی تھی، انہیں سمجھنے میں کم از کم مجھے کوئی غلطی نہیں لگ سکتی تھی۔ تجمل کے آنسو نکلے تو فرزانہ کے بھی آنسو نکل آئے۔ میں نے اس لڑکے کے ساتھ اس کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ وہ جذباتی تھا۔ میں وہاں سے اٹھا تو میرے ذہن میں امید کی روشنی تھی۔ بچی کا گدا اور نرل بچی کے ساتھ ہی گئی تھی۔ میں بہت حد تک یہ نتیجہ لے کر وہاں سے نکلا کہ بچی فرزانہ اور اس

ں نے غائب کی ہے اور اگر بچی عابد کی نہیں تو تجمل کی ہے۔ میں تھانے پہنچا تو فرزانہ
لے خاندان کی رپورٹ ملی۔ فرزانہ کی ماں تین خاوند کر چکی تھی جن میں سے صرف ایک زندہ
ہے۔ دو مر چکے ہیں۔ جوانی میں اس نے غیر مردوں سے جنسی عیاشی بہت کی ہے۔ اسے
ناوندوں کی صرف جائداد کے ساتھ دلچسپی رہی ہے۔ اس کے جو خاوند مر گئے ہیں ان کے
مکان اس نے اپنے نام لکھوا لیے اور جو زندہ ہے اس نے اسے اس بنا پر طلاق دی تھی کہ
ہ اس کا چال چلن اور اس کی نیت بھانپ گیا تھا۔ فرزانہ اس کے آخری خاوند کی بیٹی ہے۔
پہلے خاوندوں سے اس کے دو بیٹے ہیں جو جوان ہو کر کہیں چلے گئے ہیں۔ فرزانہ کو وہ اپنے
ڈھنگ کی ٹریننگ دے رہی ہے۔ کوئی شریف گھرانہ اس کی لڑکی کا رشتہ قبول کرنے کے
لیے تیار نہیں تھا۔ عابد کے ساتھ یہ رشتہ فرزانہ کی خالہ نے دو تین عورتوں کو ساتھ ملا کر کیا
تھا۔ ظاہر ہے کہ دلچسپی عابد کی جائیداد کے ساتھ تھی ——— جمیلہ کے گھرانے کی رپورٹ صاف
تھی۔ عابد اور فرزانہ کے گھر کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ تجمل نام کا ایک خوبصورت لڑکا عابد
کی غیر حاضری میں عابد کے گھر جاتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی اس لڑکے کے فرزانہ کے
ساتھ تعلقات بیان کیے گئے۔

میں نے عابد کی نوکرانی کو ابھی ایک طرف کیا ہوا تھا۔ یہ میرا دانستہ اقدام تھا۔ اسے میں
موقع دینا چاہتا تھا کہ یہ سمجھ لے کہ اسے تفتیش میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ وہ اس جرم میں
ضرور شامل تھی ——— میں نے عابد کو تھانے بلایا۔ اب میں سیدھی سیدھی باتیں کرنے کے
قابل ہو گیا تھا۔ عابد سے میں نے کہا ——— "مرد کا قدرتی نقص کوئی شرمندگی والی بات نہیں
ہوتی۔ آپ شاید یہ اعتراف کرنے میں بے عزتی سمجھتے ہیں کہ آپ اولاد پیدا کرنے کے
قابل نہیں۔ یہ وصف تو قدرت نے آپ کو دیا ہی نہیں، اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟"

عابد نے مجھے جھٹلانے کی کوشش کی۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر اور دونوں ڈاکٹروں کی رپورٹیں اس کے آگے رکھ دیں۔ وہ کبھی ان رپورٹوں کو دیکھتا اور کبھی اِدھر اُدھر دیکھتا جس سے اس کی گھبراہٹ ظاہر ہوتی تھی۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور جب اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے پوچھا — "آپ کو جب پتہ چلا تھا کہ فرزانہ کی گود ہری ہونے والی ہے اور آپ کی مراد پوری ہو گئی ہے تو آپ خوش کیوں نہیں ہوئے تھے؟ آپ کو افسوس کیوں ہوا تھا؟ فرزانہ کے ساتھ آپ کی اَن بَن کیوں ہو گئی تھی؟"

وہ واقعی سیدھا آدمی تھا۔ میں نے یہ سوال کر کے کوئی ایسا راز بے نقاب نہیں کیا تھا جو ساتویں زمین کے نیچے دفن تھا۔ اسے فوراً سمجھ لینا چاہئے تھا کہ پردے کی یہ باتیں مجھے فرزانہ اور جمیلہ نے بتائی ہیں اور ڈاکٹروں کی رپورٹیں مجھے جمیلہ نے دی ہیں۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ کسی ایک بھی سوال کا جواب نہ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے مردانہ وقار کو سخت ٹھیس پہنچی ہے۔ کوئی مرد کسی مرد سے یہ نہیں سننا چاہتا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ عابد کی تو زبان ہی گنگ ہو گئی۔ میں چند منٹ اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے بم پھینکا۔ میں نے کہا — "کیا آپ کو یقین ہے کہ بچی کا باپ تجمل ہے؟"

عابد کو یوں جھٹکا لگا جیسے میں نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کا ننگا تار لگا دیا ہو۔ اس نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا — "آپ کو کس نے بتایا ہے؟ جمیلہ یا فرزانہ نے؟"

"جمیلہ کو اس بات کا علم ہی نہیں" میں نے کہا — "اور فرزانہ اپنے گناہ کبھی تسلیم نہیں کرے گی — عابد صاحب! گھبرا نہ جائیں، میری مدد کریں۔ مجھے بچی برآمد کرنی ہے"

وہ اچانک بڑی ہی جاندار آواز میں بول پڑا — "مجھے اس بچی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ بچی جمیلہ نے نہیں اٹھائی اور نہ اس نے اٹھوائی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فرزانہ کے

ساتھ میری اَن بَن ہوگئی ہے۔ شادی کے فوراً بعد تجمل نے میرے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنی سادگی میں اسے فرزانہ کا بھائی سمجھا تھا۔ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ اس کا خالہ زاد ہے لیکن خالہ زاد سگے بھائی نہیں ہوتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں مجھے شک ہونے لگا کہ فرزانہ اور تجمل کے تعلقات مشکوک ہیں۔ میری نوکرانی اس روز سے میرے گھر میں ہے جس روز سے جمیلہ میرے گھر آئی تھی۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا۔ ایک روز میں نے نوکرانی سے کہا کہ وہ تجمل اور فرزانہ پر نظر رکھے لیکن اس نے دونوں کی تعریفیں شروع کر دیں۔ اور کہا کہ آپ ایسا شک نہ کریں، وہ تو بہن بھائی ہیں۔ ایک روز میں نے بہن بھائی کو نازیبا حرکتیں کرتے دیکھ لیا۔ فرزانہ، اس کی ماں اور نوکرانی نے مجھے ایسا گھبرا کہ مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں نے جو دیکھا ہے وہ شریفانہ حرکت تھی۔ میں جب تنہا ہوتا تھا تو مجھے یقین ہو جاتا تھا تجمل اور فرزانہ کے مراسم ناجائز ہیں مگر فرزانہ اور اس کی ماں کا سلوک دیکھتا اور ان کی باتیں سنتا تو میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا کہ میں نے بلاوجہ ایسا ذلیل شک کیا۔۔۔

"میں ایک روز یہ بہانہ کر کے کہ دلّی ایک کاروباری کام سے جا رہا ہوں، دلّی کے ایک اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ اس نے میرا معائنہ اس طرح کیا جس طرح پہلے دو ڈاکٹروں نے کیا تھا۔ اس نے بھی یہی فیصلہ دیا کہ میرا خون اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ میں واپس آیا تو فرزانہ نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی گود ہری ہونے کی پہلی نشانیاں ظاہر ہو گئی ہیں۔ میرا دماغ چکرا گیا۔ میں نے فرزانہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ میں بہت بڑی غلطی کر چکا تھا۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے سزا ملنی شروع ہوگئی۔ فرزانہ سے مجھے نفرت ہوگئی۔ میں نے جمیلہ سے کہا کہ وہ میرے گھر آجائے لیکن فرزانہ کی موجودگی میں وہ میرے گھر نہیں آنا چاہتی تھی۔ میں فرزانہ کو طلاق بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اسے بلانا چھوڑ دیا اور

اس نے اور اس کی ماں نے میرے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا۔ میں گھر آتا تو فرزانہ کی ماں میرے بوٹوں کے تسمے کھولنے بیٹھ جاتی۔ فرزانہ میرے پاس بیٹھ کر روتی اور اپنی محبت کا یقین دلاتی۔ میں نے اسے کبھی بھی نہیں کہا کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ میرا نہیں حقیقت یہ ہے کہ فرزانہ اور اس کی ماں جب مجھے اپنے پیار میں جکڑتی تھیں تو میں اس دھوکے میں آجاتا تھا کہ آنے والے بچے کا باپ میں ہی ہوں۔ مجھے رام کر کے فرزانہ جمیلہ کے خلاف باتیں شروع کر دیتی۔ میں جب جمیلہ کے پاس جاتا تو میرا ذہن صاف ہو جاتا۔ وہاں کوئی مکر اور فریب نہیں تھا۔ میں نے دو مکان اور ایک دکان جمیلہ کے نام رجسٹری کر دی

"مجھے اپنی نوکرانی پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماں بیٹی پیسے سے اس کا منہ بند رکھتی ہیں۔ بچی پیدا ہوئی اور تین ماہ کی ہوئی تو ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ بچی کو کوئی اٹھا لے گیا ہے۔ آپ سچ پوچھیں تو اس اطلاع سے مجھے کوئی افسوس نہیں ہو مگر میں نے یہ بھی دیکھا کہ فرزانہ کو بھی جیسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس کی ماں نے رونے کی تھوڑی سی ایکٹنگ کی پھر دونوں جمیلہ کو برا بھلا کہنے بیٹھ گئیں۔ نوکرانی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ تینوں نے کہا کہ جمیلہ یہاں آکر کئی بار یہ دھمکی دے گئی ہے کہ اگر اس گھر میں ب پیدا ہوا تو بچہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔ مجھ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں ایسا چالاک آدم نہیں ہوں۔ ایسے لوگوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے صرف محلے والوں کو دکھان کے لیے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی۔ میں کسی کو یہ بتانے سے بھی گھبراتا تھا کہ بچی میری نہ اب میری دلچسپی یہ نہیں کہ بچی برآمد کر کے مجھے دلائی جائے بلکہ یہ سراغ لگایا جائے ک بچی کو کس نے غائب کیا ہے۔ میں آپ کو یہ راز بتا سکتا ہوں کہ جمیلہ ایسا جرم نہیں کر سکتی بچی فرزانہ اور اس کی ماں نے غائب کی ہے۔ یہ بچی میری نہیں ہے۔ میری نوکرانی اس

میں شریک ہے۔ میں کوئی ثبوت نہیں دے سکتا۔"

بچی کا باپ کون؟

عابد کا بیان میں نے بہت مختصر لکھا ہے۔ وہ پورا ایک گھنٹہ بولتا رہا تھا۔ ایک بار اس کے آنسو بھی نکل آئے تھے۔ اس نے کام کی بہت سی باتیں بتادیں اور میرا ذہن اس معاملے میں صاف ہو گیا کہ بچی کی گمشدگی کے پیچھے فرزانہ اور اس کی ماں کا اپنا ہاتھ ہے اور اس جرم میں نوکرانی بھی شامل ہے اور تجمل بھی۔ مجھے شک یہ تھا کہ بچی نوکرانی کے گھر میں ہوگی۔ میں نے عابد سے نوکرانی کے گھر کے متعلق پوچھا تو اس نے ایسے علاقے کا نام لیا جہاں اسی کلاس کے لوگ رہتے تھے۔ وہاں جواری اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے لوگ بھی رہتے تھے۔ اس آبادی کے لوگوں کا آپس میں اتفاق بہت تھا۔ وہ ایک دوسرے کے جرائم پر پردہ ڈالے رکھتے تھے۔ چوری کا مال وہاں جاکر غائب ہو جاتا تھا۔ ایک گھر میں جوا چل رہا ہوتو ساتھ والے گھر کے لوگ چوکیداری کرتے تھے۔ اس بستی کے کسی گھر پر چھاپہ ہمیشہ ناکام رہتا تھا۔ کچے پکے، چھوٹے چھوٹے مکان ایک جھرمٹ کی شکل میں تھے۔ تنگ اور گندی گلیاں، اردگرد کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس آبادی کے بچے دور سے کسی مشکوک آدمی کو آتا دیکھتے تو کانوں کان ساری آبادی کو خبردار کر دیتے تھے۔ وہاں جو شریف قسم کے خانسامے، بیرے اور گھروں کے نوکر رہتے تھے وہ دوسروں کے ڈر سے ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ اس لیے میں نے نوکرانی کے گھر چھاپہ مارنے کو نظرانداز کر دیا۔ اس کی بجائے میں نے ایک اور پروگرام بنایا۔ یہ میری غلطی تھی۔

میں نے یہ غلطی مسلمان گھرانوں کی عزت بچانے کی خاطر کی۔ میں اس معاملے میں خاصا

جذباتی ہوا کرتا تھا۔ میں نے اپنے پولیس کے فرائض سے ہٹ کر یہ سوچا کہ فرزانہ اور اس کی ما
سے کہوں کہ وہ بچی خود ہی گھر لے آئیں اور میں اس شرط پر ان کے خلاف مقدمہ قائم نہ
کروں گا کہ فرزانہ عابد سے طلاق لے کر تجمل کے ساتھ شادی کرے۔ ایسا اقدا
میرے فرائض میں شامل نہیں تھا بلکہ فرائض کے منافی تھا۔ میں دراصل جمیلہ کو از سرِ نو عابد
گھر آباد کرنا چاہتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور عابد اپنی لغزش کی سزا بھگ
چکا تھا۔

میں فرزانہ کے گھر چلا گیا۔ وہ مجھے بے تکلفی سے ملی۔ اس کی ماں بھی دوڑی آئی۔
نے اس کی ماں کو کمرے سے نکال دیا۔ میرے رویے میں اب دوستی کا رنگ ناپید تھا۔ میر
فرزانہ سے کہا — "فرزانہ جیل جانا چاہتی ہو یا اپنی ماں کے گھر؟" اس کے چہرے اور آ
میں جو تبدیلی آئی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر ہونٹ حرف کا
اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

میں نے اسے کہا — "میری بات پورے دھیان سے سنو۔ اگر میری جگہ کوئی
ہندو تھانیدار ہوتا تو اب تک تم، تمہاری ماں، تجمل اور تمہاری نوکرانی حوالات میں بند
ہوتیں اور بچی برآمد ہو چکی ہوتی۔ میں مسلمان ہوں تمہیں ساری عمر کی بے عزتی سے بچ
چاہتا ہوں۔"

"کوئی ماں اپنی بچی کو خود غائب نہیں کر سکتی۔" اس نے کہا — "عابد صا
کو خدا نے بارہ سال بعد ...."

"یہ بچی عابد کی نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس کا باپ تجمل
تم انگریزی پڑھ سکتی ہو؟"

"نہیں۔"

میں نے ڈاکٹروں کی رپورٹیں اسے دکھا کر کہا ۔ "عابد کسی بچے کا باپ نہیں بن سکتا۔ یہ ڈاکٹروں نے لکھا ہے۔ تم جائیداد کے چکر میں پڑ کر سیدھی جیل جا رہی ہو۔ میں تمہیں اس چکر سے بچانا چاہتا ہوں۔ بچی کو گھر لے آؤ۔"

"لیکن بچی ہے کہاں؟" وہ ابھی تک مجھے چکر دے رہی تھی۔

"جہاں تم نے اسے بھیجا ہے۔" میں نے کہا۔ "جہاں تم نے دودھ کی بوتل، بچی کے گدے اور کپڑے بھیجے ہیں۔ تم بچی نہیں لاؤ گی تو آج شام سے پہلے پہلے میں وہاں سے بچی کو لے آؤں گا۔ پھر تم اپنی ماں، نوکرانی اور تجمل کے ساتھ تین سال کے لیے جیل خانے میں چلی جاؤ گی۔"

اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ڈیوڑھی میں ۔ کوئی باہر گیا ہے۔ میں اُدھر توجہ نہ دے سکا کیونکہ فرزانہ نے بڑی زور سے چلانا شروع کر دیا ۔ "امی! امی ادھر آنا ذرا۔ دیکھو یہ کیا کہہ رہے ہیں" ۔ اس کی ماں فوراً کمرے میں آ گئی۔ تب میں نے سمجھا کہ وہ دروازے کے ساتھ ہی کھڑی باتیں سن رہی تھی۔ میں نے اسے بھی یہی باتیں کہیں جو میں فرزانہ سے کہہ چکا تھا۔ وہ پرانی کھلاڑی تھی۔ ایسی بھولی بنی جیسے بڑی ہی سیدھی سادی عورت ہو اور جیسے اسے میری کوئی بات سمجھ ہی نہ آ رہی ہو۔ تجمل اور فرزانہ کے تعلقات کے متعلق اس نے قرآن کی قسمیں کھائیں اور کہا کہ یہ منہ بولے بہن بھائی ہیں۔ یہ تو جمیلہ اور عابد نے آپ کے کان بھر دیئے ہیں۔

میں نے اس کے ساتھ آدھا گھنٹہ مغز کھپائی کی مگر یہ عورت پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھی۔ مجھے بہرحال یقین ہو چکا تھا کہ بچی ان دونوں نے غائب کی ہے اور

اب انہیں ڈھیل دی تو یہ بچی کا گلا گھونٹ کر لاش جمیلہ کے گھر پھینکنے کی کوشش کریں گی اور یہ حرکت رات کو ہی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچی کو زندہ ہی ان کے گھر کسی طرح رکھ آئیں اور لوگوں سے کہیں کہ جمیلہ کے گھر چل کر دیکھو، بچی کو اس نے چھپا رکھا ہے۔ یہ تو میری قیاس آرائی تھی کہ وہ بچی کو اب کس طرح استعمال کریں گی۔ ایسے استعمال کے لیے بڑے ہی قابل دماغ کی ضرورت تھی۔

ماں کی ایکٹنگ دیکھ کر بیٹی بھی دلیر ہو گئی۔ اس نے کہا — "اگر مجھے بتا دیں جمیلہ نے آپ کو کیا دیا ہے تو میں اس سے دوگنا دوں گی۔ آپ ہمیں اس طرح پریشان کریں" — میرے صبر، تحمل اور اسلامی جذبے کی حد ختم ہو گئی۔

میرا ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل باہر کھڑے تھے۔ میں نے باہر جا کر کانسٹیبل کو عابد کی دفتر نما دکان کا پتہ دیا اور اسے کہا کہ فوراً گھر آ جائے۔ وہ دوڑتا گیا میں کمرے میں آ کر باورچی خانے میں چلا گیا پھر دوسرے تین چار کمروں میں گیا۔ مجھے نوکرانی نظر نہ آئی۔ فرزانہ اور اس کی ماں بھی کمرے سے باہر آ گئیں۔ میں نے ان پوچھا — "نوکرانی کہاں ہے؟" — ماں نے کہا "یہیں تھی" — اور اس نے ا آوازیں ویسی ہی شروع کر دیں۔ پھر بولی — "شاید چلی گئی ہے" — تب مجھے یاد آ جس وقت فرزانہ نے کمرے میں ماں کو بلایا تھا، اُس وقت کوئی ڈیوڑھی میں سے کر باہر گیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا — "اس وقت وہ کہاں گئی ہو گی؟" — مجھے جو علاوہ مشکوک تھا۔ ماں اور بیٹی کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ ماں نے میری وہ باتیں سن تھیں جو میں فرزانہ سے کر رہا تھا۔ اس نے نوکرانی کو بھگا دیا ہے کہ بچی کو غائب دو — میرے پاس صرف ہیڈ کانسٹیبل ہی تھا۔ تھانے سے مزید کانسٹیبل بلانے کا

وقت بچانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ میں اب ان عورتوں کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ان دونوں کو زیرِ حراست سمجھ کر انہیں کمرے میں بٹھا لے اور ادھر اُدھر نہ ہونے دے۔ میں خود تھانے کی طرف دوڑا۔ مجھے کم از کم چار کانسٹیبلوں کی ضرورت تھی۔

نوکرانی کو گئے بہت وقت ہو گیا تھا۔ مجھے تھانے تک پہنچنے کچھ وقت لگ گیا۔ میں نے چار کی بجائے چھ لاٹھی بردار کانسٹیبل ساتھ لیے اور اس آبادی کی طرف نکل کھڑا ہوا جہاں نوکرانی رہتی تھی۔ ایک تانگہ روکا اور ہم سات افراد اسی میں بیٹھ گئے۔ آبادی تک پہنچے۔ کانسٹیبلوں کو آبادی کے راستے روکنے کے لیے بھیج دیا اور ایک آدمی سے نوکرانی کا گھر پوچھ کر میں اس کے گھر تک پہنچا۔ ایک لاغر اور مریض سا آدمی باہر کا دروازہ بند کرکے تالا لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ والے آدمی نے بتایا کہ یہ اس کا خاوند ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے تالا چھین کر پرے پھینک دیا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ چھوٹا سا صحن اور صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ میں نے پوچھا ——— "وہ کہاں ہے؟" ——— خاوند نے معصوم بن کر جواب دیا ——— "وہ تو صبح سے کام پر گئی ہوئی ہے۔ رات کو آئے گی" ——— میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور کمرے میں چلا گیا ——— میں نے اس عورت کے خاوند کو کان سے پکڑ کر گھسیٹا اور دھکا دے کر اندر پھینک دیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے کہا ——— "بچی کی جو چیزیں یہاں پڑی ہیں وہ نکال دو" ——— وہ گھبرایا ہوا اٹھ رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ اس نے لاٹھی کا نیچے والا سرا اس کے سینے پر رکھ کر زور سے دبا یا! اور اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا اور زور سے دبایا تو اس کی ہیچ نکل گئی۔ کانسٹیبل

نے کہا ــــ "سنا نہیں تم نے انہوں نے کیا کہا ہے؟"

اس نے گردن گھما کر دیکھا تو میں نے اس کے سینے سے کانسٹیبل کی لاٹھی ہٹا دی، مجھے ڈر تھا کہ وہ مر ہی نہ جائے۔ وہ تو لاش کی مانند تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اس نے چپ چاپ ایک ٹرنک کھولا اور اس میں سے بچی کے چار فراک، دو سویٹر، اونی موزے دودھ کی بوتل اور دو نپل اور چیزیں نکال دیں۔ میں نے پوچھا۔ "بچی کہاں ہے؟"

اس نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا ــــ "وہ لے گئی ہے۔"

"کہاں؟"

"کوئی سی قسم لے لو۔ اس نے مجھے نہیں بتایا۔" اس نے جواب دیا اور رو پڑا۔ کہنے لگا "ایک گھنٹہ ہوا دوڑتی آئی تھی۔ بچی کو کمبل اور گدے میں لپیٹ کر اٹھا لیا اور مجھے کہا کہ بچی کی تمام چیزیں ٹرنک میں رکھ دو۔ میں نے رکھ دیں۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ باہر تالا لگا کر کہیں چلے جاؤ۔ رات کو آنا۔ میں رات دیر سے آؤں گی پھر وہ چلی گئی اور میں نے بچی کی ساری چیزیں چھپا دیں۔ میں ذرا باہر نہیں گیا۔ اب جا رہا تھا کہ آپ آ گئے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ بچی کو کہاں لے گئی ہے۔"

اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا ــــ "حضور! میں اس عورت کا خاوند ضرور ہوں لیکن اس کا محتاج ہوں۔ میں دمے کا مریض ہوں۔ ذرا سی محنت کرتا ہوں تو دمے کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہ عورت نوکری چاکری کر کے مجھے پال رہی ہے۔ خدا نے تین بیٹے دیئے تھے۔ تینوں مر گئے ہیں۔ میں اس عورت کے کسی کام میں دخل نہیں دیتا۔ ایک روز بچی کو لے آئی اور مجھے بتایا کہ اپنا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا۔ یہ ایسے گھر سے مانگ کر لائی ہوں جہاں پہلے ہی سات لڑکیاں ہیں۔ اسے

بالوں گی۔ اس نے بہت سارے نوٹ بھی ٹرنک میں رکھے اور مجھے بتایا کہ یہ بچی کے ماں باپ نے دیئے ہیں ـــ حضور! مجھے پہلے ہی روز سے شک تھا کہ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے لیکن میں اس کا حکم مانا کرتا ہوں، اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا۔"

بیمار خاوند، ہوشیار بیوی

میں نے اس سے مزید معلومات لینے کے لیے کہا کہ وہ تھانے چلے۔ بچی کی جو چیزیں برآمد ہوئی تھیں ان کا منتیر نامہ تیار کیا۔ ضروری کارروائی کی اور اسے ساتھ لے کر تمام کانسٹیبلوں کو اکٹھا کیا۔ اسے چار کانسٹیبلوں کے ساتھ تھانے بھیج دیا اور خود دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر عابد کے گھر کی طرف چلا گیا۔ وہاں تک پہنچتے کچھ اور وقت لگ گیا۔ اب تو ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ مجھے بچی کو بچانا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ فرزانہ، اس کی ماں اور نوکرانی کو قبل از وقت پتہ چل گیا تھا کہ میں جان چکا ہوں کہ بچی نوکرانی کے گھر میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوری کارروائی کر کے بچی کو وہاں سے اٹھا لیا۔ میں اپنی اس غلطی پر پچھتانے لگا کہ ان عورتوں کو مسلمان سمجھ کر ان کی عزت بچانے کا ارادہ کیا اور اپنی ڈیوٹی سے کوتاہی کی۔ مجھے عابد کے بیان کے فوراً بعد ان تینوں کو حراست میں لے لینا چاہیے تھا یا انہیں شامل تفتیش مشتبہ قرار دے کر تھانے لے جا کر بٹھا دیتا اور نوکرانی کو تفتیش کی ایسی چکی میں پیستا کہ وہ خود بچی برآمد کر دیتی۔ مگر مجھے مسلمانوں کی محبت نے مارا اور اب میں بُوگیر کتے کی طرح بھاگا پھر رہا تھا۔ میرا مسئلہ اب یہ تھا کہ بچی کو زندہ برآمد کر دوں۔ وہ حلال کی تھی یا حرام کی، میرے لیے وہ معصوم اور بے گناہ بچی تھی۔ بچی کا قتل میری برداشت سے باہر تھا۔

اوپر سے شام ہو گئی تھی۔ یہ ایک اضافی دشواری پیدا ہو گئی۔ میں نے ایک تانگہ

پکڑ لیا اور اسے اپنے ساتھ رہنے کو کہا۔ اس سے رات بھر کے پیسے پوچھے تو اس نے

ہاتھ جوڑ کر کہا ۔"عالی جاہ! آپ کا اپنا تانگہ ہے۔ پیسے آپ ہی سے لینے ہیں؟"۔

ہماری مجبوری دیکھئے کہ ایسے ایسے خطرناک کیسوں کی تفتیش کے لیے ہمارے پاس

ٹرانسپورٹ نہیں ہوتی تھی۔ میں نے تانگے والے کو یقین دلایا کہ اسے پیسے ملیں گے۔ یہ

بیگار نہیں۔ وہ خوش ہو گیا۔ میرے ساتھ دو کانسٹیبل تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بچی کو یہ

لوگ جمیلہ کے گھر نہ پھینک دیں۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو جمیلہ کے گھر کا اتا پتا بتا کر کہا

کہ وہ جمیلہ کے باپ سے کہے کہ آج رات اپنے گھر کا پہرہ دیں۔ سردیوں کی راتیں تھیں

لوگ اندر سوتے تھے۔ میں نے پیغام بھجوایا کہ رات اپنی چھتوں پر بھی نظر رکھیں اور

محلے کے دو تین آدمی رات کے وقت کہیں چھت پر چھپے رہیں۔ میں نے کانسٹیبل سے

کہا کہ وہ انہیں ساری بات بتا دے تاکہ وہ گھبرا نہ جائیں۔

دوسرا کانسٹیبل میرے ساتھ تھا۔ میں عابد کے گھر پہنچا۔ دروازے پر دستک دیئے

بغیر اندر چلا گیا۔ دروازے کے سامنے والے کمرے میں مجھے فرزانہ، اس کی ماں اور نوکرانی

سر جوڑے ہوئے بیٹھی نظر آئیں۔ مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں اور اٹھیں۔ نوکرانی کا ان عورتوں

کے ساتھ یوں بیٹھنا سارے شکوک رفع کر رہا تھا۔ میں نے نوکرانی کی چٹیا پکڑی اور کھینچ

کر اسے لٹو کی طرح گھما دیا۔ پھر اسے سیدھا کر کے پوچھا ۔"بچی کہاں ہے؟"۔ اس نے

بڑی زور زور سے رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ مجھے رحم اس لیے نہیں آیا تھا کہ یہ عورتیں

مجرم تھیں۔ غصے کی وجہ یہ تھی کہ میں انہیں جیل خانے اور رسوائی سے بچانا چاہتا تھا

اور وہ مجھے چکر دے رہی تھیں۔

میں نے فرزانہ اور اس کی ماں سے پوچھا ۔"اب بھی وقت ہے بتا دو بچی کہاں

ہے ؟"۔ انہوں نے بھی نوکرانی کی طرح رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ عابد گھر میں نہیں تھا۔ تین عورتوں کی چیخ و پکار سے محلے کی عورتیں، بچے اور پانچ چھ مرد جمع ہو گئے۔ میں نے گھر کی تلاشی لی۔ کوئی کونہ نہ چھوڑا۔ بچی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میرے پاس ایک کانسٹیبل تھا۔ مجھے اب تجمل کو پکڑنا تھا اور نہ جانے کہاں کہاں چھاپے مارنے تھے اور یہ خیال بھی تھا کہ بچی شہر سے باہر بھی لے جائی جا سکتی ہے۔ ریلوے سٹیشن، لاریوں کے اڈے اور شہر سے باہر جانے والے راستوں کی ناکہ بندی ضروری تھی۔

میں نے محلے کے ایک آدمی کو یہ کہہ کر تھانے دوڑایا کہ اے۔ ایس۔ آئی، ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کو فوراً بلا لائے۔ میں نے جو تانگہ روکا ہوا تھا وہ اسے دے دیا۔ ادھر تینوں عورتیں تماشائیوں کو دیکھ کر زور زور سے رو رہی تھیں جیسے ان پر ظلم ہو رہا ہو۔ میں نے ڈیوڑھی سے تماشائیوں کو ہٹا دیا اور ان عورتوں سے کہا کہ اب وہ آسمان میرے سر پر پھینک دیں پھر بھی وہ قانون کے پھندے سے نہیں نکل سکیں گی۔ میں نے کانسٹیبل کو ڈیوڑھی میں کھڑا کر دیا اور خود اندر ٹہلنے لگا۔ فرزانہ نے مجھے سر کے اشارے سے ایک کمرے میں چلنے کو کہا اور خود کمرے کے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ اس کی ماں اور نوکرانی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں فرزانہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔ آگے آ کر میرے ہاتھ پکڑ لیے اور بولی ___ "مجھے ہر وقت اپنا غلام سمجھیں۔ جب بھی اور جہاں بھی بلائیں گے میں آ جایا کروں گی۔ آئیے میں دروازہ بند کر دیتی ہوں"۔

ایسی پیشکش کبھی کبھی تھانیداروں کو ہوا کرتی ہے۔ ایسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو ٹھکرانا کسی مرد کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ دین دھرم والے روپے پیسے کی

رشوت کو ٹھکرا دیا کرتے تھے لیکن ایسی دلکش رشوت سے منہ موڑنے کے لیے پتھر جیسے کردار کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ رشوت آج بھی چلتی ہے اور قتل، ڈاکے اور اغوا کی پکڑی ہوئی وارداتیں گول ہو جاتی ہیں ــــ میں اُس وقت جوان تھا۔ ننگی گالیاں دیا کرتا تھا۔ انتہائی ذلیل بکواس کر لیتا تھا۔ ان کے بغیر تفتیش مکمل نہیں ہوتی تھی لیکن مجھ میں یہ وصف معلوم نہیں کہاں سے آگیا تھا کہ مسلمان عورت کی خاطر اپنی نوکری کو بھی خطرے میں ڈال دیا کرتا تھا۔ کہاں یہ مسلمان بیٹی مجھے اپنا آپ رشوت کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ میں وہ باتیں اور حرکتیں لکھنا نہیں چاہتا جو اس نے مجھے گمراہ کرنے کے لیے کیں اور میرے کردار اور ایمان کو کیسی کڑی آزمائش میں ڈالا۔ یہ باتیں بہت ہی ننگی اور فحش ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بچیاں ایسی باتیں پڑھیں۔

میں نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔ دروازے کی طرف چلا تو اس نے میرا راستہ روک لیا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا اور شاید میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ ہے وہ لڑکی جسے رسوائی سے بچانے کے لیے میں نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی تھی مگر اس لڑکی نے آزار بند کھول کر اس طرح چھوڑ دیا تھا کہ اس کی شلوار اس کے پاؤں میں گری ہوئی تھی ــــ دروازے کی چٹخنی کھلی تھی۔ میں دروازے کی طرف چلتا تو وہ مجھے روک لیتی۔ میں نے تنگ آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بال مٹھی میں لے کر بڑی زور سے کھینچے اور مروڑا دے کر لڑکی کو پرے پھینک دیا۔ لڑکی کے دانت پسنے لگے اور اس کے منہ سے "سی" کی ہلکی سی آواز نکلی۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ فرزانہ کی ماں اور نوکرانی نے ہاتھ مل مل کر چلانا شروع کر دیا ــــ "ہائے، یہ دیکھو کیا ظلم ہو رہا ہے۔ ہماری بیٹی پر جھوٹا الزام لگا کر اس کی

عزت لُوٹ رہا ہے" ـــ وہ یہی کچھ بکتی کمرے سے نکل گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیا چال ہے۔ انہیں غالباً یہ توقع تھی کہ میں فرزانہ کی پیش کش قبول کر لوں گا اور وہ مجھے موقعہ پر پکڑ لیں گی۔ فرزانہ بھی چالاک تھی۔ اس نے یہ سوچا ہو گا کہ میں اسے قبول تو کر نہیں رہا اس لیے ڈرامہ مکمل کرنے کے لیے شلوار ہی اتار دوں۔

ان عورتوں کو یہ امید ہو گی کہ میں ڈر جاؤں گا اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے ان کی شرطیں مان لوں گا۔ لیکن میں نے کچھ بھی نہ کیا۔ وہ چیختی رہیں، منہ میں جو آیا بکتی رہیں اور میں ان کے سامنے ٹہلتا رہا۔ پولیس والوں کا واسطہ تو اس سے بھی زیادہ ذلیل اور خطرناک صورتِ حال سے پڑ جاتا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکوؤں، قاتلوں، فرزانہ سے زیادہ حسین اور چالاک لڑکیوں، کٹی پھٹی لاشوں اور نامی گرامی استادوں سے جن کا واسطہ پڑتا ہے وہ اگر تین عورتوں سے ڈر جائیں تو قانون کا اللہ ہی حافظ ہے۔ وہ بکتی رہیں اور میں ان کے سامنے اس طرح ٹہلتا رہا جیسے میرے کان ہی نہیں ہیں۔ بدبختوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ انہوں نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ وہ مجرم ہیں اور جرم سے بچنے کے اوچھے طریقے بھی جانتی ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ یہ شخص تو پتھر ہے یا برف ہے، وہ خود ہی چپ ہو گئیں ـــ اتنے میں عابد آ گیا۔ اسے دیکھ کر معلوم نہیں کیوں میری ہنسی نکل گئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی جو میری ہنسی سے دور ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ میں نے کہا ـــ "خدا کے بندے تم تو طوائفوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہو"۔ اسے دیکھ کر تینوں چپ ہو گئیں۔ فرزانہ نے شلوار باندھ لی تھی۔ ان کا ڈرامہ فلاپ ہو گیا تھا۔

میں نے عابد کو بتایا کہ یہ تینوں حراست میں ہیں۔ ابھی انہیں پولیس سٹیشن لے جا رہا ہوں۔ تم جمیلہ کو یہاں لے آؤ۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس

نے بتایا کہ وہ جمیلہ کے گھر سے آ رہا ہے۔ کانسٹیبل نے وہاں بتا دیا تھا کہ رات کو اپنے گھر کا پہرہ دیں۔ عابد اپنے اس گھر کی خبر لینے آ گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی، تو اس نے کہا کہ جب میں ان تینوں کو تھانے لے جاؤں گا تو وہ جمیلہ کے گھر چلا جائے گا تاکہ وہاں نظر رکھے ــــ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اے۔ ایس۔ آئی بشمبر ناتھ ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبل آ گئے۔ میں نے ان تینوں کو اے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ تھانے بھیج دیا تھا۔ مجھے آج بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے تین مسلمان عورتیں ایک ہندو کے حوالے کر دی تھیں۔ وہ باہر نہیں نکل رہی تھیں۔ انہیں گھسیٹنا پڑا اور دھکیل دھکیل کر تانگے میں بٹھانا پڑا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو تجمل کے گھر کا پتا بتا کر بھیجا کہ اسے لے آئے۔ باقی کانسٹیبلوں کو ریلوے سٹیشن اور لاریوں کے اڈے پر بھیج دیا۔ تاکہ ہندی کے جو انتظامات کرتے تھے، کیے اور میں عابد کے گھر بیٹھا رہا۔

تجمل کی تلاش

عابد کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے تجمل کا انتظار وہیں کرنا تھا اور مجھے صرف اس جواب کی توقع تھی کہ تجمل گھر نہیں ہے۔ یہ احساس میرے اندر پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ بچی کی گمشدگی میں تجمل بھی شامل ہے۔ آخر یہی جواب آیا کہ تجمل گھر سے دوپہر کے بعد گیا تھا اور تک واپس نہیں آیا۔ اسے خالہ نے پالا تھا اور وہیں رہتا تھا۔ میں خود وہاں چلا گیا۔ رات کا وقت تھا۔ خالہ کا دروازہ خالہ کے خاوند نے کھولا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ مجھے اندر لے گیا۔ میں نے اس سے پوچھا ــــ "وہ جب تجمل گھر سے نکلا تھا اس وقت آپ گھر میں تھے؟" ــــ وہ گھر نہیں تھا۔ میں نے کہا ــــ "آپ کی بیوی گھر میں ہو گی۔ اسے بلائیے

وہ جھجک گیا جیسے بیوی کو نہیں بلانا چاہتا تھا۔ میں اب کسی کے ساتھ مروت کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے دبدبے سے کہا۔ "میں نے کہا ہے کہ اپنی بیوی کو بلاؤ"۔ وہ فوراً اٹھا۔ اندر گیا۔ اندر سے اس کی بے آواز سنائی دی ۔ "تمہیں کہہ کر ہار گیا ہوں کہ اس حرامزادے کو سمجھا لے یا گھر سے نکال دے۔ اب باہر آ کر پولیس کو جواب دے وہ کہاں گیا ہے"۔

خالہ آ گئی۔ اس کی زبان کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا ۔ "تمہاری بہن، بھانجی اور اس کی نوکرانی گرفتار ہو چکی ہیں۔ اگر تم بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اگر اپنی عزت عزیز ہے تو میں جو پوچھوں وہ صحیح صحیح بتا دو۔ تجمل کس وقت گھر سے نکلا تھا؟" اس نے تقریباً وہی وقت بتایا جس وقت میں فرزانہ کے کمرے میں بیٹھا تھا اور کوئی ڈیوڑھی میں سے گزر کر باہر گیا تھا۔ یہ نوکرانی تھی۔ میں نے خالہ سے پوچھا ۔ "وہ کسی کے بلانے پر باہر گیا تھا یا خود ہی نکل گیا تھا؟"

"بلایا تو کسی نے نہیں تھا"۔ اس نے کہا "جہاں تک مجھے یاد ہے وہ خود ہی نکل گیا تھا"۔

"اس وقت باہر کا کوئی آدمی، بچہ یا کوئی عورت تمہارے گھر میں آئی تھی؟ اچھی طرح یاد کر کے بتاؤ"۔

"ہاں، فرزانہ کی نوکرانی آئی تھی"۔ اس نے جواب دیا "کہتی تھی کہ میری بہن نے اسے بھیجا ہے کہ ان کی خیر خیریت معلوم کر آئیں۔ بہت دنوں سے میری بہن مجھے نہیں ملی تھی"۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نوکرانی وہاں کیوں گئی تھی۔ کسی ہوش مند پولیس آفیسر کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ میں نے خالہ سے کہا ۔ "اب دماغ پر ذرا زور دو اور بتاؤ

کہ جب نوکرانی یہاں آئی تھی، اُس وقت تجمل کہاں تھا۔ اگر تمہیں یاد نہ ہو تو میں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔ تجمل کسی کمرے میں ہوگا اور نوکرانی کی آواز سن کر باہر نکل آیا ہوگا۔ تم نے شاید دیکھا نہ ہو۔ نوکرانی نے اسے آنکھ سے کوئی اشارہ کیا ہوگا اور نوکرانی کے جانے کے فوراً بعد نکل گیا ہوگا"۔۔۔ میں نے بات ختم کی تو خالہ کا خاوند بول پڑا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔۔۔ "داروغہ جی جو پوچھتے ہیں وہ سولہ آنے سچ بتانا ورنہ اس بدکار کے ساتھ خود بھی ذلیل ہوگی اور مجھے بھی ذلیل کراؤ گی"۔

خالہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔۔۔ "میں نے کوئی اشارہ نہیں دیکھا۔ یہ ضرور دیکھا تھا کہ نوکرانی باہر گئی تو تجمل بھی باہر نکل گیا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔" میں نے خالہ کے خاوند سے پوچھا۔۔۔ "آپ نے تجمل کو بدکار کیوں کہا تھا؟ وہ کیا کرتا ہے؟"

"آوارہ ہے" اس نے جواب دیا۔۔۔ "اسے ہم نے پالا ہے۔ بڑی اچھی تربیت دی تھی۔ جوان ہوا تو فرزانہ کے ساتھ لگ گیا۔ اس لڑکی نے اسے پیسے دے دے کر خراب کر دیا ہے۔ فرزانہ کے ماں باپ کے گھر میں شرم تو ہے ہی نہیں۔ فرزانہ کی شادی ہوئی تجمل نے وہاں جانا شروع کر دیا۔ دو روز نہ جائے تو یہی نوکرانی کسی بہانے آتی ہے، بات میری بیوی سے کرتی ہے اور تجمل سمجھ جاتا ہے کہ اسے فرزانہ نے بلایا ہے۔ نوکرا کے ساتھ ہی وہ نکل جاتا ہے۔ لڑکا ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ خاوند کی آدھی آمد تو وہ تجمل کو دے دیتی ہے۔ وہ جو کپڑے پہنتا ہے وہ میں تو خواب میں بھی اسے نہیں پہنا سکتا"۔

"آپ کو معلوم ہے نا کہ فرزانہ کی بچی گم ہو گئی ہے؟" میں نے اسے کہا۔ "بچی کو فر

اور اس کی ماں نے خود غائب کیا ہے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اگر آپ بچی کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو صاف صاف بتا دیں۔ آپ محفوظ رہیں گے۔ اگر مجھے تحقیقات میں پتہ چلا کہ آپ کا بھی اس میں ہاتھ ہے تو پھر سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہ سوچ لیجیے کہ آپ گواہ بننا چاہتے ہیں یا ملزم۔ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔"

بہت سی جرح کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان لوگوں کا اس جرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ تجمل کو جونہی وہ گھر آئے تھانے لا سکتے ہیں؟ خالہ کا خاوند ایسی ضمانت پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ ہم اسے ہتھکڑیاں تو لگا نہیں سکتے۔ تھانے کا نام سن کر بھاگ جائے گا ــــ میں نے کانسٹیبل کو اس محلے میں چھوڑ دیا اور تھانے چلا گیا۔ تینوں عورتیں حراست میں بیٹھی تھیں۔ انہیں کہا کہ وہ اقبال جرم کرنا چاہتی ہیں یا میں خود شہادت اور ثبوت مہیا کر دوں۔ ان کے دماغ ابھی تک ٹھکانے نہیں آئے تھے۔ ابھی تک انہیں امید تھی کہ وہ مجھے الو بنا لیں گی۔

میں نے اقبالِ جرم پر زیادہ زور نہ دیا اور نوکرانی کے خاوند کو بلایا۔ اسے میں نے پہلے ہی تھانے بھجوا دیا تھا۔ اسے کہا کہ وہ اچھی طرح یاد کر لے کہ اس کی بیوی بچی کو کب اور کتنے بجے گھر لائی تھی، پھر اس کی پرورش کس طرح ہوتی رہی اور بچی کو کب اور کتنے بجے لے کر گئی۔ اس کے لیے میں نے رضائی اور چارپائی کا بندوبست کر دیا اور خود اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ جسم اور دماغ کا برا حال ہو گیا تھا۔ میں نے تینوں عورتوں کے کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ میں انہیں بھوکا رکھنا چاہتا تھا اور آدھی رات کے بعد ان سے بیان لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہیں حوالات میں بند کرا دیا۔

پانی گرم کرا کے میں نہایا اور کھانا کھایا۔ میری بیوی اس قسم کی وارداتوں میں بہت

دلچسپی لیا کرتی تھی۔ میں یہ واردات اسے سنانے بیٹھ گیا اور رات کے گیارہ بج گئے۔ میں نے ڈیوٹی کانسٹیبل سے کہا تھا کہ مجھے رات دو بجے جگا دے۔ میں اس وقت ان عورتوں سے تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ میں سو گیا۔۔۔ میری بیوی نے مجھے جگایا۔ کہنے لگی کانسٹیبل آیا ہے۔ میں سمجھا دو بج گئے ہیں۔ گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ کوئی اور بات تھی۔ مجھے کوفت ہوئی کہ کوئی اور کیس آگیا ہے۔ باہر نکلا تو کانسٹیبل نے کہا۔ "بچی آگئی ہے"۔۔۔ میں سمجھا، شاید خواب دیکھ رہا ہوں۔ کانسٹیبل نے یہ کہہ کر مجھے پوری طرح بیدار کر دیا کہ مشرف اور سوہندا سنگھ ایک لڑکے کو پکڑ لائے ہیں، بچی اس کے پاس ہے۔ مشرف اور سوہندا میرے کانسٹیبل تھے۔

میں کمبل لپیٹ کر اپنے دفتر میں گیا۔ وہاں تجمل بنچ پر بیٹھا تھا۔ اس نے بچی کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ بچی چھوٹے سے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی اور سوئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر تجمل اٹھا۔ سردی سے اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے۔ گرم کپڑوں میں بھی وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے انگیٹھی جلانے کو کہا۔ تجمل نے بڑے رحم طلب لہجے میں کہا۔ "میں ساری بات بتا دوں گا۔ مجھے کھانا کھلا دیں۔ بھوک اور سردی سے مر رہا ہوں"۔ میں نے اسے کہا۔ "اٹھو"۔۔۔ اور اسے اپنے کوارٹر میں لے گیا۔

بچی کو بستر میں ڈال دیا۔ وہ فوراً جاگ اٹھی اور بھوک سے رونے لگی۔ اس کے کمبل میں دودھ کی بوتل لپٹی ہوئی تھی، بوتل خالی تھی۔ میری بیوی نے بوتل میں دودھ ڈال کر اسے پلانا شروع کر دیا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ سالن اور روٹیاں بچی ہوئی ہیں، وہ گرم کر دے اور چائے بنا دے۔ تجمل کو میں نے رضائی میں بٹھا دیا اور اس کے دل سے پولیس اور جرم کا بوجھ اور خوف اتارنے کے لیے میں نے گپ شپ شروع کر دی۔

میرا انداز دوستانہ تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ میری تفتیش ختم ہو گئی تھی۔ کھانا آ گیا۔ تجمل نے کھایا اور پھر اسے چائے پلائی۔ میں نے اس سے بچی کے متعلق کچھ بھی نہ پوچھا۔ اس نے بڑی لمبی آہ بھری اور اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے۔ پھر وہ مسکرایا اور بولا ــ "میری زندگی یہی تھی۔ نہ ماں کا پیار ملا نہ باپ کا۔ نہ کوئی بہن دیکھی نہ کوئی بھائی دیکھا اور جوان ہوتے تو جیل خانے کا دروازہ کھل گیا" ــ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "مجھے کتنی سزا ملے گی؟"

"یہ تمہاری بات سن کر بتاؤں گا" میں نے کہا ــ "اگر تم نے میرا مسئلہ حل کر دیا تو ہو سکتا ہے میں تمہیں صاف بری کرا لوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرنا" ــ اس نے پوچھا کہ وہ صرف اس بچی کی گمشدگی کے متعلق بتائے یا اپنے متعلق بھی کچھ بتائے۔ میں نے اسے کہا ــ "تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ میرے آگے رکھ دو۔ مجھے اپنا دوست اور اپنا بھائی سمجھو۔"

پاپی کا پیار

اس نے اپنے بچپن سے بات شروع کی اور اُس رات پر آ کر ختم کی جب وہ مجرم کی حیثیت سے ایک تھانیدار کی حراست میں بیٹھا تھا۔ مختصر یہ کہ اسے باپ کی تو کچھ یاد ہی نہیں کہ کیسا تھا۔ ماں کا دھندلا سا تصور اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ اُس وقت تین سال کا تھا جب اس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ وہ دونوں نوجوانی میں مر گئے تھے۔ تجمل کو خالہ نے سنبھال لیا لیکن تجمل کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ خالہ نے اسے پیار سے نہیں بلکہ برادری میں ناک رکھنے کی خاطر اسے گود لیا تھا۔ تجمل نے

جب ہوش سنبھالا تو خالہ کے دو بچوں نے اسے اپنا نوکر بنا لیا۔ خالہ اور خالو کا رویہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جس سے تجمل کے دل میں یتیمی کا احساس شدید ہو گیا۔ اسے اس گھر سے روٹی کپڑا ملتا اور رات کو سونے کے لیے بستر مل جاتا تھا۔ خالہ کے بچے اس سے کچھ بڑے تھے۔ وہ اسے پیٹ بھی ڈالتے تھے اور اس کی شکایت پر خالہ انہیں کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ اُس زمانے میں سکول جانے والے بچے کو گھر سے ایک پیسہ ملا کرتا تھا جو آج کے آٹھ آنے کے برابر تھا۔ تجمل سکول داخل ہوا تو اسے پیسہ نہیں ملتا تھا۔ خالہ اس کے سامنے اپنے بچوں کو ایک ایک پیسہ دیا کرتی تھی۔ خالو کے دل میں تو تجمل کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ وہ تجمل سے جب بھی بولتا ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں بولتا تھا۔ تجمل اکیلے اکیلے رویا کرتا تھا۔ اسے صرف پیار کی ضرورت تھی جو اسے کہیں سے بھی نہ ملا۔

تجمل نے مجھے بچپن کے بہت سے واقعات سنائے جو خالہ کے گھر کے ظلم کو ظا کرتے تھے۔ اسے وہ ہر ایک موقعہ یاد تھا جب خالو یا اس کے بچوں نے پیٹا تھا۔ وہ خوا میں صرف ماں کو دیکھتا رہا۔ اس نے کہا ــــ "میں بھوکا اور ننگا رہ سکتا تھا۔ ان پڑھ ر [illegible]تا مگر پیار کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے ماں یاد آتی تھی تو میں گھ دور جا کر رویا کرتا تھا" ــــ دس سال کی عمر میں اسے پیار مل گیا۔ یہ فرزانہ سے ملا۔ اور فرزانہ کی عمر میں تھوڑے سے دنوں کا ہی فرق تھا۔ تجمل خوبصورت لڑکا تھا۔ فرزا اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ کبھی کبھی تجمل کو ایک یا دو پیسے دیتی اور گھر میں ک مٹھائی یا پھل فروٹ آئے تو وہ بھی اسے لا دیتی تھی۔ فرزانہ اس کی دوسری خال بیٹی تھی۔ فرزانہ کی ماں کو بھی یہ بچہ اچھا لگا۔ اس نے تجمل سے کہا کہ آ کر فرزانہ کے کھیلا کرو۔ یہ پیار کی پہلی لہر تھی جو تجمل کی زندگی میں آئی۔ وہ سارے دکھ بھ

ماں کو بھی بھول گیا۔ اب وہ اپنے گھر صرف سونے کے لیے جاتا تھا۔

فرزانہ کی ماں پکّی پاپن تھی۔ وہ جنسی عیاشی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس پر جائداد کا خبط سوار تھا۔ یہ باتیں تجمل کو جوان ہو کر معلوم ہوئیں۔ بچپن اور لڑکپن میں فرزانہ اور اس کی ماں اس کے لیے پریاں تھیں۔ "جیسی ماں ویسی بیٹی" بالکل صحیح مقولہ ہے تیرہ سال کی عمر میں فرزانہ نے تجمل کو اپنے ساتھ جنسی لذت سے آشنا کر دیا۔ تجمل نے اسے بھی پیار سمجھا اور اس کے بعد فرزانہ کو جب کبھی تنہائی ملتی تجمل کو بلا لیتی اور اس کے ساتھ میاں بیوی کا کھیل کھیلتی۔ تجمل نے میٹرک پاس کر لیا۔ فرزانہ صرف آٹھ جماعتیں پڑھ سکی تھی۔ تجمل غیر معمولی طور پر خوبصورت نکلا۔ خالو اسے اپنے کاروبار میں لگانا چاہتا تھا جو تجمل کو پسند نہیں تھا۔ اس پر دونوں میں گرما گرمی ہوتی رہتی تھی۔ تجمل کو اب ان کی محتاجی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ فرزانہ اسے پیسے دیتی رہتی تھی اور ماں سے کہہ کر اسے ہر عید پر نئے کپڑے بھی سلوا دیتی تھی۔ فرزانہ کی ماں کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اب تجمل اچھا برا سمجھنے لگا تھا۔ مگر وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ بدکاری کو پیار نہیں کہتے۔ وہ یہ ضرور سمجھ گیا کہ فرزانہ کی ماں اچھے چال چلن کی عورت نہیں لیکن اس کے لیے وہ بہت اچھی تھی۔

تجمل کی عمر بیس سال ہو گئی تو ایک روز فرزانہ نے اسے یہ خبر سنائی کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ تجمل کو بہت رنج ہوا۔ وہ تو یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ اس کے سوا فرزانہ کی اور کہیں شادی ہو ہی نہیں سکتی اس نے فرزانہ سے شکایت کی تو فرزانہ نے اسے کہا۔ "شادی کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہے کہ ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ وہ تو نام کا خاوند ہو گا۔ میرے اصلی خاوند تو تم ہو گے"۔۔۔ تجمل کی تسلی نہ ہوئی۔ فرزانہ نے اسے اصل قصہ ان الفاظ میں سمجھایا۔۔۔ "میری جس آدمی کے ساتھ شادی ہو رہی ہے وہ مجھ سے سولہ

سترہ سال بڑا ہے۔ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ امی نے پوری جاسوسی کرلی ہے۔ یہ آدمی اولاد پیدا نہیں کرسکتا۔ اس کی بہت ساری جائیداد ہے اور اس کے پاس پیسہ بھی بہت ہے۔ میں اسے اولاد دوں گی اور اس کی ساری جائیداد اپنے نام لکھوالوں گی۔ اس کا پیسہ اپنے قبضے میں کروں گی۔ اولاد تمہاری ہوگی اور تمہیں بہت عیش کراؤں گی۔"

میرے شریف النفس دوستوں کو فرزانہ کی بات بڑی عجیب لگے گی لیکن یہ دیکھیے کہ اس نے کس ماں سے تربیت حاصل کی تھی۔ اس کے دماغ میں ماں نے صرف دو چیزیں ڈالی تھیں ـــ جنس اور جائیداد ـــ بیٹی کو اس نے مزید جائیداد حاصل کرنے کے لیے تیار کرلیا تھا۔ خود تو بوڑھی ہوگئی تھی۔ تجمل کو گناہ میں پیار ملا تھا۔ اس لیے اسے فرزانہ کی بات کوئی ایسی بُری نہ لگی کہ اس سے روٹھ جاتا ـــ فرزانہ کی شادی عابد کے ساتھ ہوگئی۔ تجمل عابد کی غیر حاضری میں فرزانہ سے ملتا رہا۔ نوکرانی کو فرزانہ نے روپے پیسے اور اچھے اچھے کپڑوں سے مٹھی میں لے لیا۔ اس کے نتیجے میں یہ بچی پیدا ہوئی۔ فرزانہ اور اس کی ماں عابد کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں تاکہ وہ فرزانہ کے نام اپنی جائیداد لکھ دے مگر ایک روز پتہ چلا کہ عابد نے آدھی سے زیادہ جائداد اپنی پہلی بیوی جمیلہ کے نام رجسٹری کردی ہے۔ اب فرزانہ اور اس کی ماں عابد کو جمیلہ کے خلاف گمراہ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگیں۔ انہوں نے ایک طریقہ یہ بھی سوچا کہ جمیلہ کبھی عابد کے گھر آئے، فرزانہ اور اس کی ماں اِدھر اُدھر ہوجائیں، تجمل کو بلایا جائے اور وہ جمیلہ کے ساتھ زبردستی کرے یا اسے اپنے ساتھ ورغلائے اور اگر ایسا ہوجائے تو اسے موقعہ پر پکڑا جائے۔ مگر یہ سکیم بن نہ سکی

ایک روز فرزانہ کی ماں نے یہ سکیم بنائی کہ بچی کو غائب کر دیا جائے اور الزام جمیلہ پر عائد کیا جائے۔ ان سب میں ایسا قابل دماغ کوئی بھی نہیں تھا جو اس سکیم کے تمام پہلوؤں کے خطروں اور مشکلات پر غور کرتا۔ ان کے دماغوں پر جائیداد، لالچ اور جمیلہ کے خلاف حسد سوار تھا۔ جرم تو کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے، لیکن جرم کو چھپائے رکھنا اور پولیس کو گمراہ کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ صرف تجربہ کار جرائم پیشہ لوگوں کا ہی کام ہے اور اس نوعیت کا جرم جو کسی دوسرے کو پھنسانے یا اس سے کوئی پیچیدہ مقصد حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، فرزانہ یا اس کی ماں جیسے دماغ سے مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں نے ایسی ہی نوعیت کے جرم کی سکیم بنا لی اور سمجھ بیٹھے کہ بس کام ہو گیا۔ بچی کو چھپائے رکھنے کی ذمہ داری نوکرانی نے لے لی۔ اس کا معاوضہ اس نے پانچ سو روپیہ لیا۔ اس نے یہ یقین بھی دلایا کہ وہ اپنی آبادی کے کسی آدمی کو ساتھ ملا کر بچی جمیلہ کے گھر رکھ آئے گی۔ یہ عورتیں بچی کو جان سے مارنے اور لاش جمیلہ کے دروازے کے سامنے یا کسی اور جگہ رکھ دینے کے لیے بھی تیار ہو گئیں۔ تجمل نے یہ ڈیوٹی اپنے ذمے لے لی کہ بجائے اس کے کہ کسی باہر کے آدمی کو اس کام میں شریک کیا جائے بچی کو جمیلہ کے گھر رکھنے کا کام وہ خود کرے گا۔

میں نے جب یہ سکیم سنی تو مجھے بہت ہنسی آئی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ سکیم کامیاب ہو جاتی۔ تجمل نے یہ مشورہ دیا تھا کہ بچی کو ہلکا سا زہر دے کر جمیلہ کے گھر رکھ دیا جائے گا۔ اس سے یہ ہو گا کہ انہیں جب پتہ چلے گا کہ بچی ڈیوڑھی میں یا چھت پر پڑی ہوئی ہے تو وہ اسے ضرور اٹھائیں گے اور لوگوں کو اور پولیس کو بتائیں گے۔

ہلکا زہر اثر کرتے کرتے بچی ان کے ہاتھوں میں مر جائے گی پھر کوئی بھی نہیں مانے گا کہ بچی کو ئی اور رکھ گیا ہے۔ سب کہیں گے کہ جمیلہ نے حسد کی وجہ سے بچی کو اغوا کرایا اور اب زہر دے کر مار دیا ہے لیکن بچی اُس وقت وہاں رکھی جائے گی، جب پولیس بچی کی تلاش شروع کر دے گی۔ بہر حال یہ سکیم پاس ہو گئی۔

تیسرے ہی دن نوکرانی نے جمیلہ کو اپنے محلے کے ایک گھر میں داخل ہوتا دیکھا تو فرزانہ کو بتایا۔ فرزانہ کی ماں وہیں تھی۔ اس نے کہا کہ یہ موقعہ اچھا ہے محلے کا ایک گھر تو یہ گواہی دے گا کہ جمیلہ یہاں آئی تھی۔ چنانچہ نوکرانی کو اسی وقت بچی دے دی گئی۔ بچی کا ایک ہی گدا تھا۔ یہ گدا، دودھ کی بوتل، اس کے کپڑے وغیرہ اکٹھے کر کے نوکرانی نے بچی اور ان کپڑوں وغیرہ کو ایک لحاف میں رکھا اور لپیٹ کر لے گئی۔ بچی سوئی ہوئی تھی۔ باہر کسی کو شک نہ ہوا کہ لحاف میں بچی لے جائی جا رہی ہے۔ اپنے خاوند کو جو دمے کی بیماری کی وجہ سے اس کا غلام تھا، اس نے یہ بتایا کہ یہ بچی وہ پالنے کے لیے لائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خاوند کو سختی سے کہا کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دے کہ اس گھر میں بچی ہے نوکرانی کو یقین تھا کہ آج پولیس کو رپورٹ کر دی جائے گی اور کل صبح بچی کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ الزام جمیلہ پر عائد کر دیا جائے گا اور اس سے اگلے دن بچی زندہ یا مردہ جمیلہ کے گھر رکھ دی جائے گی۔ لہٰذا بچی کو چار دن چھپائے رکھنا کوئی مشکل نہیں

پیار کا صلہ

بچی کو غائب کر دیا گیا۔ عابد کو اطلاع دی گئی۔ اس نے تھانے میں رپو

درج کرادی۔ تجمل نے میری تفتیش اور سراغرسانی کے متعلق کہا۔ "ہم سمجھتے تھے کہ پولیس والے جادوگر تو نہیں ہوتے، ہم انہیں گمراہ کرلیں گے لیکن آپ نے اگر ہم سب کو گمراہ کردیا۔ آپ نے اتنی تیزی سے ہمارے سارے راستے بند کردیئے کہ ہم سب چکرا گئے۔ اُس وقت ہم نے محسوس کیا کہ بچی کو جمیلہ کے گھر رکھنا کسی صورت ممکن نہیں۔ فرزانہ اور اس کی ماں سخت پریشان رہنے لگیں۔ انہوں نے آپ کو رشوت دینے کا بھی فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کو رشوت پیش کی تھی یا نہیں۔ آج دوپہر کے وقت میں اپنے گھر تھا۔ نوکرانی آئی۔ اس نے میری خالہ سے کوئی بات کی۔ ہم نے اشارے مقرر کیے ہوئے تھے۔ میں کمرے سے باہر آیا۔ اس نے میری طرف خاص انداز سے دیکھا۔ میں اشارہ سمجھ گیا۔ وہ چلی گئی تو میں سمجھا کہ فرزانہ نے بلایا ہوگا لیکن نوکرانی گلی کی نکڑ پر کھڑی تھی۔ مجھے سر سے اشارہ کیا تو میں اس کے پیچھے چلا گیا۔ آگے جاکر میں اس کے ساتھ جا ملا۔ اس نے چلتے چلتے کہا۔ "پولیس کو پتہ چل گیا ہے۔ تھانیدار، فرزانہ اور اس کی ماں کو کہہ رہا ہے کہ بچی تمہارے پاس ہے اسے فوراً نکالو۔ فرزانہ کی ماں نے مجھے کہا ہے کہ تجمل کو ساتھ لو اور بچی اس کے حوالے کرکے اسے کہو کہ اسے جمیلہ کے گھر پھینک سکتے ہو تو پھینک آؤ ورنہ نہر میں یا دور کہیں جنگل میں لے جاکر مار دو اور دفن کردو۔ میں نے نوکرانی سے کہا کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ذرا حوصلہ کرو۔ اس نے مجھے وہ باتیں سنائیں جو آپ فرزانہ سے کر رہے تھے۔ اس وقت فرزانہ کی ماں اور نوکرانی کمرے کے دروازے کے ساتھ کھڑی آپ کی باتیں سن رہی تھیں۔ میں نے بھی سوچا کہ معاملہ بہت بگڑ گیا ہے۔ اب یہی راستہ ہے کہ بچی آپ کے سامنے رکھ دی جائے یا اسے اس دنیا سے ہی غائب کردیا جائے۔"

تجمل ایک جگہ چھپ گیا۔ نوکرانی اپنے گھر گئی اور بچی کو اٹھا لائی۔ اس نے یہ عقلمندی کی کہ بچی کے لیے دودھ کی بوتل بھی بھر کر لے آئی تاکہ بچی جتنی دیر تجمل کے پاس رہے روئے نہیں اور دودھ پی کر سو جائے۔ تجمل نے بچی لے لی۔ دودھ کی بوتل چھپا لی۔ وہ شہر کے اُس حصے کی طرف چلا گیا جہاں اسے کوئی پہچانتا نہیں تھا۔ تین ماہ کی بچی کو اٹھائے اٹھائے پھرنا کوئی ایسی حرکت نہیں کہ کسی کو شک گزرے۔ اس جرم کی سکیم میں یہ مشورہ تجمل نے ہی دیا تھا کہ وہ بچی کو جمیلہ کے گھر چھوڑ آئے گا لیکن بچی اس کے پاس آئی تو وہ سوچ بھی نہ سکا کہ وہ دلیری کا یہ کارنامہ کر سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ بچی کو فرزانہ کے حوالے کر دے لیکن اس کے دل میں فرزانہ کی محبت جاگ اٹھی اور اس کے ساتھ ہی یہ ڈر کہ فرزانہ کے گھر تھانیدار بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چکرا گیا۔ اب نجات کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ اندھیرا ہو جائے تو بچی کو شہر سے دور لے جائے اور اسے مار کر دفن کر دے یا نہر میں پھینک دے ___ میں جس وقت فرزانہ کے گھر جا کر اسے، اس کی ماں اور نوکرانی کو حراست میں لے چکا تھا اور ایک آدمی کو اپنے اے۔ایس۔آئی اور کانسٹیبلوں کو بلانے کے لیے بھیج دیا تھا، اس وقت تجمل بچی کو اٹھا شہر سے باہر چلا گیا تھا۔

میں نے سروس کے دوران ہزارہا ملزموں اور گواہوں کے بیان لیے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک واردات کا مقدمہ ختم ہوتے ہی اس کے تمام تر بیانات ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ پھر دوسری واردات کے بیانات سامنے آجاتے ہیں۔ ریٹائرڈ پولیس آفیسر کو تو بہت سے ملزموں اور گواہوں کی شکلیں بھول جاتی ہیں، ان کے بیان کہاں یاد رہتے ہیں لیکن کچھ ملزم ایسے میرے سامنے آئے ہیں جن کے اقبالی بیانات کو میں ساری

ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ شاید اس لیے کہ میں جذباتی انسان ہوں۔ بات جو جذبات کو ہلاتی ہے ہمیشہ کے لیے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ تجمل کا اقبالی بیان اسی زمرے میں آتا ہے۔ اس کے الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ میں اس کا بیان مختصر کر کے پیش کرتا ہوں:

"اب میرے ذمے یہ کام تھا کہ میں بچی کا گلا گھونٹ دوں اور اسے کہیں دفن کر دوں یا زندہ ہی نہر میں پھینک دوں۔ میں شہر سے دور نکل گیا تھا۔ وہاں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اچانک بچی نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے دودھ کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی اور وہ چپ ہو کر پینے لگی۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ بچی دودھ پی رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح ختم کروں۔ اتنے میں بچی نے دودھ پی لیا۔ میں نے بوتل اٹھالی۔ سردی پریشان کرنے لگی۔ میں نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ میں یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ بچی کو فوراً نہر میں پھینک دوں گا لیکن وہاں جا کر میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ میرا ایک ہاتھ بچی کے منہ کی طرف چلا گیا۔ بچی کے ہاتھ کمبل سے باہر تھے۔ اس نے میری ایک انگلی دونوں ہاتھوں سے پکڑ لی اور منہ میں لے کر چوسنے لگی۔۔۔۔

"اچانک میری آنکھوں کے سامنے میری ماں کی تصویر آ گئی۔ ایسے لگا جیسے اندھیرے میں مجھے اپنی ماں نظر آ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک پیاس سی پیدا ہو گئی۔ ایسی پیاس جو پانی سے نہیں بجھتی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، تجمل، اس دنیا میں تیرا کون ہے؟ —— کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں جس کی رگوں میں میرے باپ کا خون ہو۔ کوئی بھی نہیں جو میری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ بچی کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جو کمبل سے باہر تھے کمبل میں کر دیئے۔ بہت ٹھنڈ تھی۔ میں نے بچی کو سینے سے لگا کر اپنا منہ اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ میرے دل سے آواز اٹھی کہ

یہ میرا خون ہے۔ یہ میرے پیار کی نشانی ہے۔ یہ میری بچّی ہے۔ میں اپنے پیار کو اپنے ہاتھوں نہیں ماروں گا۔ اُس وقت اس ساری دنیا کا ہر ایک انسان مجھے دھوکہ اور فریب نظر آیا۔ فرزانہ سے مجھے نفرت ہو گئی۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میں جسے پیار سمجھتا رہا وہ گناہ تھا۔ فرزانہ کو میں اس لیے اچھا لگا تھا کہ خدا نے مجھے ایسی اچھی شکل وصورت دی تھی، جو فرزانہ کو پسند آ گئی تھی اور پھر میں اسے اس لیے اچھا لگتا تھا کہ اس کے لیے گناہ کی لذّت کا ذریعہ بنتا تھا۔ وہ میرے جسم کے ساتھ کھیلتی رہی۔ پھر اس نے مجھے اتنے بڑے گناہ کا ذریعہ بنایا کہ میں اتنی معصوم بچّی کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا۔۔۔

”ماں کے بعد اگر میں کسی کو اپنا کہہ سکتا تھا تو وہ یہ بچّی تھی جو میرا اپنا خون تھا۔ میں بچّی کو سینے سے لگا کر بہت رویا۔ بہت دیر گال بچّی کے گالوں سے رگڑتا رہا اور مجھے اتنا لطف آیا جو میں نے پہلے کبھی نہیں پایا تھا۔ فرزانہ کا جسم یاد آیا تو مجھے اپنے آپ سے بدبو آنے لگی۔ اسے میرے ساتھ اتنا ہی پیار تھا جتنا بچّے کو کھلونے سے ہوتا ہے۔ ایک کھلونا ٹوٹ گیا تو دوسرا آ جائے گا۔ اس نے مجھے ایسا کھلونا بنایا کہ پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔ اس نے عابد کو کھلونا بنایا کہ اس سے جائیداد اور دولت ملے گی۔

”میں نے یہ بھی سوچا کہ بچی کے ساتھ نہر میں کود جاؤں اور اس دنیا سے آزاد ہو جاؤں۔ لیکن میں بچی کو نہیں مارنا چاہتا تھا۔ یہ ایک گناہ کی پیداوار تھی لیکن یہ گناہ میرا تھا اور یہ میرا خون تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ زندہ رہوں گا اور اسے بھی زندہ رکھوں گا مگر جب حقائق سامنے آئے تو میں گھبرا گیا۔ لیکن میرا دماغ صاف ہو چکا تھا۔ میں نے حقیقت کو صاف دل سے دیکھا اور اس فیصلے کو بہتر سمجھا کہ تھانے جاتا ہوں اور بچّی وہاں رکھ کر ساری بات کہہ سناتا ہوں۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ آپ ان تینوں کو پکڑ لا-

ہیں۔ انہیں میں نے یہاں آکر حوالات میں دیکھا ہے۔ میں برآمدے میں داخل ہوا تو نوکرانی حوالات کی سلاخوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دوسریوں کو بتایا تو وہ بھی اس کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ انہیں حوالات میں بند دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

تجمل بچی کو اٹھائے ہوئے واپس آرہا تھا۔ وہ اُس راستے سے شہر میں داخل ہوا، جہاں میرے دو کانسٹیبل مشرف اور سوہندا سنگھ ڈیوٹی پر تھے۔ انہوں نے اسے روکا اور بچی کو دیکھ کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جارہا ہے؟ اس نے بتادیا کہ وہ بچی کو تھانے میں پیش کرنے کے لیے جارہا ہے۔ کانسٹیبلوں کو پتہ چل گیا کہ انہیں اسی بچی کے لیے یہاں ڈیوٹی پر کھڑا کیا گیا ہے۔ وہ تجمل کو تھانے میں لے آئے۔

میں تجمل کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے جذبات کو ہلا دیا تھا۔ مدد کی یہی ایک صورت تھی کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنالوں۔ یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ یہ تینوں عورتیں اقبال جرم نہ کریں۔ میں نے بہت غور کیا کہ ان کے اقبالِ جرم کے بغیر میں استغاثہ مضبوط بنا سکتا ہوں یا نہیں۔ ملزم کو پکڑ لینا تو اتنا مشکل نہیں ہوتا، عدالت میں اسے مجرم ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔

میں نے تجمل کو حوالات کے دوسرے کمرے میں بند کر دیا اور بچی کو اپنی بیوی کی تحویل میں رہنے دیا۔ صبح کے وقت دفتر میں بیٹھا اور کیس سامنے رکھ کر قانون کے تقاضوں کے مطابق شہادت اور ثبوت کا جائزہ لیا۔ فرزانہ، اس کی ماں اور نوکرانی کو میں نے بالکل نہیں کہا کہ وہ اقبالِ جرم کریں۔ ان سے بیان لینے لگا تو وہ ابھی تک کہہ رہی تھیں کہ یہ جمیلہ کی کارروائی ہے۔ میں نے اسی روز ان کا اور تجمل کا ریمانڈ لے لیا۔ پھر ضروری عدالتی کارروائی کر کے تجمل کو وعدہ معاف گواہ منظور کرالیا۔ بچی کو عدالت میں پیش کر کے تھانے

کے علاقے کے ایک معزز فرد کے سپرد کر دی۔

آٹھویں روز تینوں عورتوں کا چالان تین تین دفعات میں عدالت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے بڑا ہی قابل ہندو وکیل کیا جس نے میرے استغاثہ کی بنیادیں بھی ہلا دیں لیکن شہادت اور ثبوت ایسے تھے کہ وکیل ہار گیا۔ تینوں عورتوں پر تینوں دفعات کے جرم ثابت ہو گئے اور ہر ایک کو مجموعی طور پر پانچ پانچ سال سزائے قید بامشقت سنا گئی۔ انہوں نے اپیل کی۔ وہ بھی مسترد ہو گئی ــــ مقدمے کے دوران ہی عابد جمیلہ کو اپ گھر لے آیا تھا۔ تجمل سے فیصلے کے بعد ملاقات نہیں ہوئی۔ عدالت نے بچی اس کو دے دی تھی۔

ایک ماں ایک معمّہ

قاتل کا صرف یہ سراغ ملا کہ لاش کے ناخنوں میں قاتل کا خون اور گوشت کے دو ذرّے تھے۔ لڑکی اچھے چلن کی نہیں تھی مگر قاتل ایک معمّہ تھا۔

"پاپی کا پیار" میں شہر کی ایک آبادی کا ذکر آتا ہے جہاں ایک ملزمہ نے تین ماہ کی بچی کو اغوا کر کے چھپایا تھا۔ اس واردات کے تقریباً تین ماہ بعد اسی آبادی میں ایک نوجوان لڑکی قتل ہو گئی۔ یہ شہر کے ساتھ ملی ہوئی جھگیوں اور کچے مکانوں کی بستی تھی۔ پاکستان کے بھی شہروں میں ایسی بستیاں موجود ہیں۔ ہندوستان کے اس شہر میں بھی ایک بستی تھی، جو میرے تھانے میں آتی تھی۔ وہاں لوگوں نے خود ہی مٹی کی دیواریں کھڑی کر کے اوپر ٹین، تختوں یا سرکنڈوں کی چھتیں ڈال لی تھیں۔ بستی پھیلتے پھیلتے ایک سو گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں جھگیاں کرائے پر بھی مل جاتی تھیں۔

ان جھگیوں اور کچّے مکانوں میں محنت مزدوری کرنے والے اور چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ جانگلی سکھوں کی بھی تھوڑی سی تعداد تھی اور باقی رانگڑ مزدور تھے۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں اور گھروں میں نوکری کرنے والے لوگ، بھنگی اور چوکیدار اور اسی کلاس کے لوگ یہاں آباد تھے۔ اس بستی میں جوا بھی چلتا تھا۔ بلا لائسنس شراب اور افیم کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا آپس میں بہت اتفاق تھا۔

ان میں کوئی مذہبی تعصب نہیں تھا۔ ایک دوسرے کے جرائم پر پردہ ڈالے رکھتے تھے۔ چوری کا مال وہاں غائب ہو جاتا تھا۔ ایک گھر میں جوا چل رہا ہو یا شراب کشید کی جا رہی ہو تو پڑوسی چوکیداری کرتے تھے۔ وہاں کے کسی گھر پر پولیس اچانک چھاپہ مارے تو کبھی کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ کچے پکے، چھوٹے چھوٹے مکان انگور کے گچھے کی طرح تھے۔ گلیاں تنگ، پیچ دار اور گندی تھیں۔ اردگرد کوئی اور آبادی نہیں تھی۔ کسی مشکوک آدمی کو بستی کی طرف آتا دیکھ کر وہاں کے بچے کانوں کان ساری بستی کو خبردار کر دیتے تھے۔ وہاں شریف قسم کے لوگ بھی رہتے تھے۔ وہ بدمعاشوں کے ڈر سے ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ گواہی کی ضرورت پڑے تو سب ٹال جاتے تھے۔ وہاں کوئی واردات ہو جائے تو پولیس پریشان ہو جاتی تھی۔ یہ لوگ پولیس کی مار پیٹ اور بے عزتی کی تو پرواہی نہیں کرتے تھے۔

میری جو شامت آئی تو اس بستی میں ایک نوجوان لڑکی قتل ہو گئی۔ اگر یہ واردات پاکستان کی کسی بستی میں ہوتی تو کاغذوں میں ہی غائب کر دی جاتی۔ مگر وہ زمانہ انگریزوں کا تھا اور اس کے ساتھ میرا اپنا ایمان بھی پکا تھا۔ میرے لیے بنگلے کی میم اور غریب بچی برابر تھیں۔ رپورٹ مقتولہ کی ماں دو پڑوسیوں کے ساتھ درج کرانے آئی۔ ماں نے بیان دیا کہ لڑکی جس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی اور غیر شادی شدہ، شام کے بہت دیر بعد گھر سے یہ کہہ کر نکلی کہ سہیلیوں کے ساتھ باہر جا رہی ہے۔ بہت وقت گزر گیا واپس نہ آئی۔ جن لڑکیوں کے ساتھ ہر شام باہر جاتی تھی ان سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ نہیں گئی۔ بستی سے آگے لمبا غیر آباد علاقہ تھا۔ شام کے بعد لڑکیاں ذرا گھومنے پھرنے نکل جایا کرتی تھیں۔ اس لیے مقتولہ کا شام کے بعد گھر سے نکلنا معمولی بات تھی۔

مقتولہ کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ وہ ایک اینگلو انڈین گھرانے میں باورچی تھا۔ رات دس

بجے کے لگ بھگ گھر آیا کرتا تھا۔ اس رات وہ گھر نہیں آیا۔ جب اس کی بیوی نہانے میں آئی تھی۔ اس وقت تک وہ گھر نہیں آیا تھا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ ماں رات بھر پریشان رہی۔ صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے بستی میں یہ خبر پھیل گئی کہ باہر ایک لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ پھر ماں کو اطلاع ملی کہ لاش اس کی بیٹی کی ہے۔

میں اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر موقعۂ واردات پر گیا۔ میرے سامنے ایک لاش زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر کسی نے چادر ڈال دی تھی۔ چادر ہٹا کر دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکی تھی۔ اچھی شکل و صورت والی تھی۔ لاش پیٹھ کے بل تھی۔ منہ آدھا کھلا ہوا اور آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ سینے پر اور دوسرا باہر کو زمین پر تھا۔ کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور شلوار قمیض صحیح حالت میں تھی۔ ظاہری طور پر قتل سے پہلے لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ کانوں کی بالیاں بتا رہی تھیں کہ یہ واردات صرف قتل کی ہے۔ اس کے پیچھے نیت رہزنی اور آبرو ریزی کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ بغور نظری معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ لڑکی کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ گردن پر نشان صاف تھے۔ نشان رسّی کے نہیں تھے۔ چہرے پر کوئی خراش نہیں تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے نہیں تھے۔ جسم پر جو کپڑے تھے، ان پر کہیں خون کا دھبہ بھی نظر نہ آیا۔ تشدد کا یا قاتل سے مقابلہ کرنے اور جان بچانے کی کوشش کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ پاؤں کے چپل بھی نہیں اترے تھے۔

جیسا کہ میں اپنی پہلی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ پولیس کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ لاش کے ساتھ یا لاش کے اردگرد گھاس کی ایک خشک پتی، لباس سے گرا ہوا دھاگے کا ذرا سا ٹکڑا، چھوٹا سا بال یا کوئی ایسی چیز جس پر کسی کی نظر ہی نہ جائے، قتل کی کہانی

بیان کر دیا کرتی ہے یا کم از کم تفتیش کرنے والوں کو مجرم کے گھر کا راستہ دکھا دیتی ہے۔ میں نے پہلے تو لاش کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ مجھے لاش کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے سروں پر ذرا ذرا سا خون لگا ہوا نظر آیا۔ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے سروں پر بھی ایسا ہی خون تھا۔ یہ خون مقتولہ کا اپنا نہیں تھا کیونکہ اس کی انگلیاں زخمی نہیں تھیں، نہ جسم پر کوئی زخم تھا۔ لاش کے ناخن بڑھے ہوئے تھے لیکن یہ آج کی طرح فیشن کے طور پر نہیں بڑھائے گئے تھے بلکہ بہت دنوں سے کاٹے نہیں گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیوں کے ناخنوں کے اندر کی طرف ذرا ذرا سی کھال چپکی ہوئی تھی۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ قاتل نے جب مقتولہ کا گلا ہاتھوں سے دبایا تو مقتولہ نے ناخنوں سے قاتل کا چہرہ یا اس کے بازو یا ہاتھ زخمی کر دیئے۔ یہ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ بڑے کام کا سراغ تھا۔

لاش کے اردگرد دیکھا۔ پاؤں کے نشان تماشائیوں کے پاؤں سے اور لاش پر چادر ڈالنے والے کے پاؤں سے ختم ہو چکے تھے۔ دراصل پاؤں کے نشان دیہاتی علاقے میں کام آیا کرتے ہیں۔ پولیس آفیسر کی نگاہ تیز ہو تو مجرم جائے واردات پر اپنی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لاش کے اردگرد نگاہ دوڑائی تو ایسی کوئی نشانی نظر نہ آئی۔ دو قدم دور سیپ کا ایک بٹن پڑا نظر آیا جو قمیضوں کو لگایا جاتا ہے۔ بظاہر بیکار چیز تھی مگر میں نے بٹن اٹھا لیا۔ یہ خاصا پرانا تھا۔

جو کاغذی کارروائی کرنی تھی وہیں مکمل کی اور لاش اٹھوا کر ہسپتال بھیج دی۔ اس کے ساتھ جو کاغذ بھیجے ان میں لاش کی انگلیوں کے سروں پر خون کے دھبوں اور ناخنوں کے ساتھ لگے ہوئے گوشت کے ذروں کے متعلق خاص طور پر لکھا۔ خون کے متعلق میں نے لکھا

کر اسے مکمل طور پر ٹیسٹ کیا جائے تاکہ ہم جب مشتبہ افراد کے خون کے نمونے بھیجیں تو تفتیش میں مدد ملے۔

خون مقتولہ کا نہیں تھا

اس دوران لڑکی کا باپ بھی آ گیا۔ ادھیڑ عمر اور مریض سا آدمی تھا۔ بیٹی کی لاش دیکھ کر وہ پریشان تو بہت ہوا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ میں نے اس کے ساتھ رسمی سی بات کی تو اس نے آہ بھر کر کہا۔ "یہ ذلت بھی میری قسمت میں لکھی تھی"۔ مقتولہ کی ماں بین کر رہی تھی۔ میں دونوں کو تھانے لے گیا۔ راستے میں میں یہ سوچتا گیا کہ یہاں میرے مخبر ہی کوئی سراغ لگا سکیں گے ورنہ میرے خیال میں اس بستی کا تو کوئی آدمی نہیں پھنسے گا ——— میں مقتولہ کی ماں کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ لڑکی کے چال چلن کے متعلق پوچھا، تو یہ عورت جھجک گئی۔ اس نے یہ تو کہہ دیا کہ ہاں، اس کا چال چلن اچھا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سچ نہیں کہہ رہی۔ لڑکی کے متعلق یہ تو پتہ چل چکا تھا کہ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کہیں رشتہ ناطہ طے ہوا تھا یا نہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک جگہ بات چل رہی تھی۔

میں نے ماں کو اس انداز سے فارغ کر دیا جیسے اس کے بعد اس سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ اسے باہر بھیج کر مقتولہ کے باپ کو بلایا۔ اس نے بھی اپنی بیٹی کا چال چلن اچھا بتایا لیکن دبی زبان میں۔ رشتے کے متعلق اس نے تفصیل سے بتایا۔ دو پیغام آئے تھے۔ ایک کے ساتھ بات پکی کی تو دوسرے نے دھمکی دے دی۔ لڑکے نے یہ

الفاظ کہے تھے ۔۔۔ "تمہاری لڑکی کی ڈولی نہیں جنازہ اٹھے گا"۔۔۔ باپ ڈر تو گیا مگر بات پکی رکھی۔ تھوڑے دنوں بعد جن سے بات پکی ہوئی تھی انہوں نے لڑکی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ انہوں نے انکار کیوں کیا تھا تو اس نے جواب دیا کہ انہوں نے وجہ نہیں بتائی، وہ لوگ شاید دوسرے گھرانے کی دھمکی سے ڈر گئے تھے۔ میں نے باپ سے پوچھا کہ وہ رات کہاں تھا۔ اس نے بتایا کہ صاحب کے گھر دیر ہو گئی تھی پھر وہیں سو گیا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ رات دس بجے کے اِدھر اُدھر گھر آجایا کرتا ہے۔ میں نے اس بات کو خاص طور پر ذہن میں رکھا کہ باپ قتل والی رات گھر نہیں آیا۔

مقتولہ کی ماں اور باپ نے لڑکی کا چال چلن بتاتے وقت جو انداز اختیار کیا تھا، اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ باپ نے ہی اسے قتل کر دیا ہو۔ یہ محض شک تھا۔ البتہ میرا یہ شک پختہ ہو رہا تھا کہ لڑکی اپنے آشنا کے رقیب کا شکار ہوئی ہے۔ شہروں کے تہذیب یافتہ اور اونچے گھرانوں میں ہارے ہوئے رقیب فلمی گانے گاتے یا آہیں بھرتے یا خطوط لکھتے ہیں مگر جن لوگوں کی بستی میں قتل کی یہ واردات ہوئی تھی وہ اغوا، قتل اور خودکشی کے سوا کوئی اور اقدام نہیں سوچ سکتے۔ اس بستی کے ہارے ہوئے رقیب آہیں نہیں بھرتے بلکہ دھمکیاں دیا کرتے اور سنگین وارداتیں کرتے تھے

میں نے اپنے اے، ایس، آئی کو دو سوالوں کا جواب لانے کے لیے بھیج دیا۔ ایک یہ کہ جن لڑکیوں کے ساتھ مقتولہ ہر شام باہر نکلا کرتی تھی، ان سے پوچھ گچھ کرے اور پھر مقتولہ کے باپ کے متعلق یہ معلوم کرے کہ کیا واقعی اینگلو انڈین صاحب کے گھر سو

گیا تھا؟ اسے بھیج کر میں نے مخبروں کو بلایا۔ انہیں ضروری ہدایات دے کر یہ خاص طور پر کہا کہ کسی ایسے آدمی کو تلاش کرو جس کے چہرے یا بازوؤں پر گہری، لمبی اور تازہ خراشیں ہوں۔ پھر انہیں رخصت کر دیا۔ میں ہسپتال کی طرف چل پڑا۔

میں برآمدے سے نکل رہا تھا کہ میرے ایک بہت پرانے سکھ کانسٹیبل سوہندا سنگھ نے کہا "چوہدری جی! لوگوں کی محبتیں ہمیں بڑی مہنگی پڑتی ہیں۔ ہیر رانجھا اچھے ستھے۔ انہوں نے پولیس کو پریشان نہیں کیا تھا۔" میں اسی لائن پر سوچ رہا تھا۔ سوہندا سنگھ کے مذاق نے میرے دماغ میں شگفتگی پیدا کر دی۔ میں ذرا رک کر اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے لگا۔ خود سوہندا سنگھ کی محبت پولیس کے لئے مہنگی ثابت ہوئی تھی۔ بارہ سال قبل اس کی محبوبہ کو اس کے رقیب نے قتل کر دیا تھا اور سوہندا سنگھ نے ڈیوٹی کے دوران رات کو جا کر قاتل کو قتل کر دیا تھا اور صاف بری ہو گیا تھا۔ اس کے تھانے نے دستاویزی ثبوت مہیا کر دیا تھا کہ سوہندا سنگھ اس رات ڈیوٹی پر تھا۔

میں جب ہسپتال پہنچا تو اس خون کا معائنہ ہو رہا تھا جس کے دھبے مقتولہ کی انگلیوں کے سروں پر تھے۔ رپورٹ تیار ہوتے مزید تین گھنٹے لگ گئے۔ سورج غروب ہونے والا تھا جب مجھے رپورٹ ملی۔ رپورٹ میں ڈاکٹروں نے لکھا تھا کہ موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ گلا ہاتھوں سے دبایا گیا ہے۔ جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں اور نہ ہی لڑکی کی آبروریزی کی گئی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا کہ لڑکی کنواری نہیں تھی — انگلیوں والے خون کا گروپ بھی لکھا گیا اور یہ بھی کہ یہ خون مقتولہ کا نہیں ہے۔ مقتولہ کے خون کا گروپ مختلف تھا۔ گوشت کے وہ باریک سے ٹکڑے جو مقتولہ کے ناخنوں میں پھنسے ہوئے تھے مقتولہ کے جسم کے نہیں تھے

میں نے ڈاکٹروں سے ایک سوال پوچھا جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ گوشت مرد کا ہے یا عورت کا۔ موت کا وقت رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان لکھا گیا۔

اس رپورٹ سے واضح ہو گیا کہ یہ زبردستی آبرو ریزی کا جرم نہیں ہے اور یہ بھی کہ لڑکی اچھے اخلاق کی نہیں تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے شادی شدہ لکھا تھا حالانکہ وہ غیر شادی شدہ تھی ——— میں جب تھانے میں گیا تو میرے اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ مقتولہ تقریباً ہر شام چار سہیلیوں کے ہمراہ باہر سیر سپاٹے کے لیے جایا کرتی تھی قتل کی شام اس نے ایک لڑکی سے کہا تھا کہ آج شام نہیں آؤں گی۔ ماں کے بیان کے مطابق وہ اسے یہ کہہ گئی تھی کہ لڑکیوں کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے آشنا سے ملنے گئی تو جس کسی کو اس نے دھتکار دیا تھا اس کے ہاتھوں ماری گئی یا اسے آشنا نے ہی کسی اور کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے شبہ میں مار ڈالا

میرے اے۔ ایس۔ آئی نے یہ بھی بتایا کہ مقتولہ کا باپ رات اپنے اینگلو انڈین صاحب کے گھر نہیں تھا۔ صاحب نے بتایا کہ مقتولہ کا باپ شام کو بہت جلدی آ گیا تھا وہ چھٹی مانگ رہا تھا۔ اس نے وقت سے بہت پہلے کھانا تیار کیا اور چلا گیا تھا۔ صاحب کے بیان کے مطابق وہ سات بجے چلا گیا تھا۔ یہ انکشاف بڑے کام کا شک پیدا کر تھا۔ لڑکی آٹھ اور نو بجے کے درمیان قتل ہوئی۔ باپ سات بجے چھٹی کر کے آ گیا اور پھر گھر نہیں آیا۔ اس نے جھوٹ بولا کہ رات صاحب کے گھر سو گیا تھا اور اب پوسٹ مار رپورٹ نے یہ تو ثابت کر ہی دیا تھا کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں تھی۔

میرے اے۔ ایس۔ آئی نے میری ہدایت کے مطابق اینگلو انڈین سے مقتول

باپ کے متعلق بہت ساری باتیں پوچھی تھیں جو مختصراً یہ ہیں کہ یہ آدمی اکثر پریشان اور کھویا کھویا رہتا تھا۔ اس نے اپنے صاحب سے یہ بھی کہا کہ اسے بنگلے میں رہنے کی جگہ دے دے یا قریب کوئی رہائش کا بندوبست کر دے۔ پہلے تو وہ یہ کہتا رہا کہ جہاں وہ رہتا ہے وہ جگہ "تنگ ہے اور وہاں لوفر لفنگے اور بدمعاش رہتے ہیں۔ پھر اس نے پریشان ہو کر بتا دیا کہ اس کی بیٹی وہاں خراب ہو گئی ہے۔ بنگلے میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ مقتولہ کا باپ بہت ہی پریشان رہنے لگا تھا۔ اس کی طبیعت میں غصہ بھی بہت تھا۔ ان معلومات کی روشنی میں مجھے اپنا کام آسان ہوتا نظر آیا۔ میں نے صبح کا انتظار نہ کیا۔ اسی وقت مقتولہ کی ماں اور اس کے باپ کو بلا لیا۔ جس کانسٹیبل کو میں نے انہیں لانے کے لئے بھیجا تھا، اسے کہا تھا کہ ان دونوں کو وہ آپس میں راستے میں کوئی بات نہ کرنے دے۔

میں ماں کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ باپ کو برآمدے میں بٹھائے رکھا۔ میں نے ماں سے کہا — "تمہاری بچی جیسی کیسی بھی تھی تمہاری بچی تھی۔ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ تم ضرور چاہو گی کہ قاتل پکڑا جائے اور اسے پھانسی ملے۔ مگر جب تک مجھے کوئی اندر کی بات نہیں بتاؤ گی قاتل نہیں پکڑا جائے گا اور اگر تم کچھ نہیں بتاؤ گی تو ہم تمہیں اور تمہارے خاوند کو پکڑیں گے۔ تم دونوں، میاں بیوی، مجھ سے وہ باتیں چھپا رہے ہو جو مجھے معلوم ہیں اور باقی معلوم ہو جائیں گی۔ میں جو پوچھوں سچ سچ بتا دو۔"

غریب سی عورت بیٹی کے قتل سے پریشان تھی اور خوفزدہ بھی۔ میری باتوں سے وہ اور زیادہ ڈری۔ میں نے اسے بولنے کی مہلت نہ دی اور پوچھا — "تمہاری بیٹی کی آشنائی کس کے ساتھ تھی؟ گھبراؤ نہیں۔ مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں۔ اولاد باہر نکل کر بگڑ جاتی ہے۔"

وہ کچھ دیر جھجکتی رہی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اشاروں اشاروں میں ڈرایا بھی تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ بتایا کہ اطہر نام کے ایک نوجوان اور غیر شادی شدہ آدمی کے ساتھ مقتولہ کا میل جول تھا۔ لڑکی اطہر کو بہت پسند کرتی تھی۔ ماں کا ارادہ تھا کہ لڑکی کا رشتہ اطہر کو ہی دے دیا جائے لیکن باپ نہیں مانتا تھا۔ اطہر کے والدین نے رشتہ مانگا تو باپ نے انکار کر دیا۔ اطہر نے دھمکی دی کہ وہ لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ رشتہ دوسری جگہ دے دیا گیا۔ لڑکی کو وہ پسند نہیں تھا۔ وہ اب اتنی منہ پھٹ ہو گئی تھی کہ اس نے باپ تک سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس جگہ شادی نہیں کرے گی۔ باپ نے اسے دو تین بار مارا پیٹا تھا۔ اس سے پہلے لڑکی کے ماں باپ کو یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ اس نے ایک اور آدمی کے ساتھ بھی تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ ماں نے میرے کریدنے پر بتایا کہ باپ لڑکی کے متعلق بہت پریشان تھا اور یہ تو اس نے کئی بار کہا تھا کہ یہ لڑکی مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اسے اپنے ہاتھوں ختم کر دوں گا۔ ایک روز اس نے لڑکی کا گلا دبا لیا تھا۔ ماں نے بڑی مشکل سے چھڑایا۔

ماں نے یہ الفاظ رو رو کر کہے ـــــ "لوگوں نے تو یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ اس لڑکی سے ماں باپ خود عصمت فروشی کرا رہے ہیں۔ خود ہی دوستی لگا کر پیسے بٹورتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں ہم نے رشتہ دیا تھا، وہاں سے جواب مل گیا۔ ان لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ لڑکی داغدار ہے، ہم نہیں لیں گے۔ اس کے بعد اطہر نے پھر رشتہ مانگا تو لڑکی کے باپ نے اس کی بے عزتی کر دی۔ اس نے اطہر سے یہ بھی کہا کہ اپنی بیٹی کسی بھنگی کو دے دوں گا، تمہیں نہیں دوں گا۔ اس کے جواب میں اطہر نے کہا تھا کہ تمہاری بیٹی کی لاش بھنگی ہی اٹھائیں گے۔ اس کی ڈولی نہیں جائے گی۔"

ناخنوں میں گوشت کس کا تھا؟

یہ مقتولہ کی ماں کے بیان کی موٹی موٹی باتیں ہیں جن سے میرے سامنے دو مشتبہ افراد آئے۔ مقتولہ کا باپ یا اطہر۔ زیادہ تر شبہ باپ پر تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اسے اندر بلایا اور اس کی بیوی کو باہر بھیج دیا۔ باپ کو اس وقت اینگلو انڈین صاحب کے گھر ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی بیٹی کی لاش گھر آچکی تھی۔ اس لئے کام پہ نہیں گیا۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہ کیا ــــ "قتل کی رات تم اپنے صاحب کے گھر سے جلدی نکل گئے تھے۔ رات کہاں گزاری تھی؟"

وہ سمجھ گیا کہ اس کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا ــــ "حضور، مجھے بخش دیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے رات کرم سنگھ کے ٹھیکے میں گزاری تھی۔ اتنی پی لی تھی کہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ رات بھر وہیں پڑا رہا" ــــ ٹھیکے سے اس کی مراد دیسی شراب کی دکان تھی۔ لائسنس یافتہ دیسی شراب کی دکانوں کے باہر بورڈ لگا ہوتا تھا۔ "ٹھیکہ شراب دیسی۔ لائسنس نمبر..." اس نے کہا۔ "آپ کرم سنگھ کو بلا کر پوچھ لیں"۔

"اب جھوٹ نہ بولنا" میں نے اسے کہا ــــ "تمہاری بیوی اپنی بیٹی کے متعلق ساری باتیں بتا گئی ہے" ــــ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ ہاتھ، بازو اور گردن دیکھی۔ مجھے کہیں کوئی خراش نظر نہ آئی۔ اس کی قمیض اتروا کر دیکھی۔ کوئی خراش نہیں تھی۔ قمیض کا کوئی بٹن ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ میں نے اس کی بیوی کے بیان کی روشنی میں اس سے جو بھی بات پوچھی اس نے صحیح بتا دی مگر جہاں بھی اسے اشارہ ملا کہ میں اس پر قتل کا شبہ کر رہا ہوں، اس نے جھوٹ بول کر بات گول کر دی۔ مثلاً میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے

ایک روز اس کا گلا دبایا تھا تو کیا تم اسے مار ڈالنا چاہتے تھے؟ اس نے جواب دیا۔
"نہ حضور، اپنی اولاد کو کون قتل کر سکتا ہے۔ میں تو اسے ڈرا رہا تھا۔ پڑوسی نہ آجاتے
بھی میں اسے چھوڑ دیتا۔"

اس کی بیوی نے بیان دیا تھا کہ اپنی بیٹی کو باپ کے ہاتھوں سے اس نے چھڑایا؛
مگر یہ کہہ رہا تھا کہ پڑوسی آگئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ گلا دبانے کا واقعہ ایک سے زیا
مرتبہ ہوا ہے۔ میں نے اسے گھیرنے کے لئے کہا ۔۔۔ "میں اس روز کی بات نہیں کر رہا
اس روز کی بات کر رہا ہوں جب تمہاری بیوی نے تمہارے ہاتھ سے تمہاری بیٹی کی
گردن چھڑائی تھی۔ پڑوسیوں نے جس روز آکے چھڑایا وہ کسی اور دن کی بات ہے۔
نے تو کئی بار بیٹی کی گردن دبالی تھی۔"

"کئی بار نہیں حضور"۔ اس نے کہا ۔۔۔ "کوئی چار پانچ مرتبہ ایسے کیا تھا۔ کیا کر
لڑکی منہ پھٹ ہوگئی تھی اور ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔"

میں نے دماغ پر بہت زور دیا کہ اسے حراست میں لے لوں؟ میرے پاس جو
جواز تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے جب بھی غصے کا اظہار کیا لڑ
گردن ہاتھوں میں دبا کر کیا۔ یہ اس کی عادت بن گئی تھی۔ آخر اس نے بستی سے باہ
جگہ لڑکی کو کسی کے ساتھ دیکھ لیا اور اس کی گردن دبا کر اسے مار ڈالا۔ مگر لڑکی کی
پر خون کس کا تھا؟ اس کے ناخنوں میں گوشت کس کا تھا؟

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ شراب کا عادی نہیں۔ کبھی کبھار ایک
گھونٹ پی لیتا ہے۔ مجھے اس پر بھی غور کرنا تھا کہ قتل کی رات اس نے اتنی زیا
پی لی کہ بے ہوش ہوگیا؟ اس نے یہ جواب دیا کہ اس شام وہ بیٹی کے کرتوت سے

قدر پریشان تھا کہ اس نے بہت زیادہ پی لی ۔۔۔ میں نے بہت سوچا، آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آدمی کو بھٹکنے کے لئے کچھ دن چھوڑ دوں۔ یہ خیال بھی آ گیا کہ اس کی بیٹی کی لاش گھر پر رکھی ہے۔ اس کے کفن دفن کا بندوبست بھی اسی کو کرنا ہے چنانچہ میں نے اسے باتوں سے یہ تاثر دیا کہ مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں اور آئندہ اسے شاید تھانے نہ بلاؤں۔ اسے جانے کی اجازت دے دی اور اپنے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ اس آدمی کا ہر لمحہ پیچھا کرنے کا بندوبست کرے مگر یہ بندوبست ہونے سے پہلے ہی اس آدمی نے ایسا بندوبست کر لیا کہ میں منہ دیکھتا رہ گیا۔

باپ گیا آشنا آیا

واقعہ یوں ہوا کہ صبح سویرے اطلاع ملی کہ ایک آدمی ریل گاڑی کے نیچے آ کر کٹ گیا ہے۔ جا کر دیکھا۔ وہ مقتولہ کا باپ تھا۔ اس کی بیٹی کی لاش گھر میں پڑی تھی۔ اگلے روز دفن کرنا تھا۔ وہ رات کے پچھلے پہر گھر سے نکل گیا۔ پھر اس کی بیوی نے اور بستی والوں نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ اس کا جسم چار ٹکڑوں میں کٹا ہوا ریلوے لائن پر پڑا تھا۔ کسی مشتبہ کی خودکشی پولیس کے لئے باعثِ رحمت ہوا کرتی ہے۔ پولیس کچھ شہادتیں تیار کر کے اس رپورٹ پر قتل کی تفتیش مکمل کر دیتی ہے کہ قاتل نے خودکشی کر لی ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے مشورہ دیا بھی کہ چلو ملک صاحب چھٹی ہوئی۔ شہادتیں ہم لے آتے ہیں۔ مقتولہ کی ماں تک سے بیان لے لیں گے کہ اس کی بیٹی کو اس کے خاوند نے قتل کیا تھا اور وہ مر گیا ہے مگر میں نے شکست تسلیم نہ کی اور میں بددیانتی کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

مقتولہ کے باپ کی خودکشی کا باعث یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اپنی بیٹی کو اسی نے قتل کیا ہے جسے ہضم کرنے کے لئے پہلے تو اس نے اتنی شراب پی کہ ساری رات بے ہوش پڑا رہا اور اس کے بعد خون سر چڑھا تو اس نے خودکشی کر لی لیکن اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ یہ ذلت برداشت نہ کر سکا کہ اس کی بیٹی پہلے بدنام ہوئی پھر قتل ہو گئی۔ اس کا ایک فقرہ مجھے یاد آیا۔ بیٹی کی لاش دیکھ کر اس نے آہ بھر کر کہا تھا ــــ "یہ ذلت بھی میری قسمت میں لکھی تھی"۔ تاہم میں نے اس نقطے کو سامنے رکھا کہ مقتولہ کا قاتل یہی شخص ہو سکتا ہے مجھے بہرحال ثبوت کی ضرورت تھی۔ ابھی مجھے اس آدمی سے تحقیقات کرنی تھی جسے مقتولہ کا رشتہ نہیں دیا گیا تھا۔

مقتولہ کے باپ کی لاش کے ٹکڑے پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا کر میں نے اس کی خودکشی کی تحقیقات اپنے اے۔ایس۔آئی کے حوالے کر دی اور اطہر علی نام کے آدمی کو بلایا۔ مقتولہ کی ماں نے بتایا تھا کہ اس شخص کے ساتھ مقتولہ کا میل جول تھا اور مقتولہ اسے بہت پسند کرتی تھی۔ وہ تھانے میں آیا۔ گٹھے ہوئے جسم کا خوبرو جوان تھا۔ اس میں کشش تھی۔ کسی لڑکی کا اسے پسند کرنا قابلِ فہم تھا۔ وہ لاریوں کے اڈے پر کام کرتا تھا اس کے متعلق مخبروں سے میں رپورٹ لے چکا تھا۔ اس کی ہسٹری تھانے میں تو نہیں تھی لیکن وہ کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ بستی میں اس کا رعب تھا۔ لڑائی مار کٹائی کا عادی تھا۔ جوا بھی کھیلتا تھا اور عورتوں کا شکاری تھا۔

وہ جوں ہی میرے سامنے آیا میری نظر اس کی گردن پر پڑی۔ اگر میں اپنے آپ پر قابو نہ کر لیتا تو میں کرسی سے اچھل کر نعرہ لگاتا ــــ "قاتل مل گیا" ــــ اس کی گردن کے دائیں اور بائیں طرف چوڑی خراشیں تھیں جو ایک ایک انچ لمبی تھیں۔ ان پر خون جما ہوا تھا اور

اوپر پہلی سی دوائی لگی ہوئی تھی، چونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قاتل یہی ہے، اس لیے میں سوال اس قسم کے سوچنے لگا جو مجھے ثبوت اور شہادت مہیا کرنے میں مدد دیں۔

"مقتولہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کتنا عرصہ رہے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا" ــــ اس نے جواب دیا۔

"دیکھو میرے دوست!" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "تم اس وقت لاریوں کے اڈے پر یا جواریوں کے اڈے پر نہیں ہو۔ یہ تھانہ ہے۔ کہو تو تمہاری ایک ایک دن کی کارگزاری تمہیں سنا دوں۔ میری مدد کرو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ مجھے چکر دو گے تو چکی میں پس جاؤ گے۔ آؤ۔ دوستوں کی طرح باتیں کریں... یہ گردن پر زخم کیسے آئے ہیں؟ ناخنوں کے معلوم ہوتے ہیں۔"

"لڑائی ہو گئی تھی۔"

"کہاں؟"

"لاریوں کے اڈے پر۔"

"کب؟"

"پرسوں۔"

"کسی نے جھگڑا لیا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"صرف دو آدمیوں کے نام بتا دو۔" میں نے کہا۔ "اور اس آدمی کا نام بھی بتا دو جس سے لڑائی ہوئی ہے۔"

وہ گھبرا گیا اور اچانک سنبھل کر بولا ــــ "دراصل جی بات یہ ہے کہ لڑائی جواریوں کے اڈے

پوسٹ مارٹم ہی تھی۔ میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وجہ آپ کو معلوم ہے۔"

"چلو" میں نے کہا "ابھی وہاں چلتے ہیں۔ میں اس آدمی کو دیکھنا چاہتا ہوں جس

سے لڑائی ہوئی تھی اور صرف وہ ایسے آدمیوں کو جنہوں نے بیچ بچاؤ کیا تھا۔"

وہ کھسیانہ سی ہنسی ہنس پڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے سرکاری کے نام چٹھی لکھی اور اطہر کو ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ میں اس کے خون معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چٹھی میں لکھا کہ اس کا خون اُس خون کو سامنے رکھ کر ٹیسٹ جائے جو مقتولہ کی انگلیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں اطہر کے گ گیا۔ اس کی ماں اور باپ سے پوچھا کہ اسے زخم کب آیا تھا۔ ماں نے وہی رات بتائی جس رات قتل ہوا تھا۔ وقت بھی وہی بتایا۔ میں نے پوچھا کہ وہ مقتولہ کا رشتہ چاہتے تھے انہوں نے بتایا کہ یہ اطہر کی ضد تھی ورنہ وہ تو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ لڑکی بدکا

وہاں سے میں ان کے ہاں گیا جنہیں مقتولہ کے رشتے کا وعدہ دیا گیا تھا مگر انہوں نے رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ گھر میں وہ لڑکا بھی مل گیا جس کے لیے رشتہ تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے میرے اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے رشتہ خود بعد میں قبول کرنے سے انکار کیوں کر دیا تھا، کہا کہ پہلے صرف سنتے تھے کہ لڑکی خراب مگر ہم نے یقین نہیں کیا تھا۔ بعد میں ثبوت بھی مل گیا۔ اس آدمی نے اپنی آنکھوں لڑکی کو اطہر کے ساتھ بالکل اس جگہ اکٹھے دیکھا تھا جہاں وہ قتل ہوئی تھی۔ یہ قتل دن پہلے کا واقعہ ہے۔ پھر اس آدمی نے اپنی آنکھوں لڑکی کو اس جگہ سے تھوڑا پر کے ایک اور نوجوان کے ساتھ بغل گیری کی حالت میں کھڑے دیکھا۔ یہ قتل سے دن پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ آدمی (لڑکے کا بھائی) دراصل لڑکی کا چال چلن معلوم کرنے

اس کا پیچھا کرتا رہتا تھا۔

اس کے علاوہ اطہر نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کی تو ان کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ یہ لوگ اس دھمکی سے ڈر گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اطہر بدمعاش ہے اور وہ اپنی دھمکی پوری کر دکھائے گا۔ اس آدمی نے یہ بھی بتایا۔ انہوں نے جب لڑکی کے باپ سے کہا تھا کہ وہ اس کی لڑکی کا رشتہ نہیں لیں گے تو وہ رو پڑا تھا اور اس نے کہا تھا۔ "اب لگتا ہے کہ یہ لڑکی میرے ہاتھوں ختم ہو گی۔"

یہ شک تو میرے دل میں پہلے ہی تھا کہ باپ کا بیٹی کے قتل میں ہاتھ ہے۔ زیادہ پختہ شبہ اطہر پر تھا۔ اب اس لڑکے کے بھائی نے ایک اور نوجوان میرے سامنے کھڑا کر دیا جس کے ساتھ اس نے مقتولہ کو دیکھا تھا۔ اس سے یہ شبہ پختہ ہوتا تھا کہ اطہر نے لڑکی کو رقابت کے جوش میں قتل کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ لڑکی خود شکاری تھی۔ وہ بیک وقت ایک سے زیادہ آدمیوں سے دوستی لگائے ہوئے تھی۔ میں نے اس نوجوان کا اتا پتا معلوم کر لیا لیکن اسے اس وقت بلانا مناسب نہ سمجھا۔ میں پہلے اطہر کے ساتھ بات مکمل کرنا چاہتا تھا۔

تھانے میں گیا تو چند منٹ بعد اطہر اور اس کے خون کی رپورٹ آ گئی۔ خون کا گروپ وہی تھا جو لڑکی کی انگلیوں پر پائے جانے والے خون کا تھا۔ خون کی دیگر تفصیلات بھی اس خون سے ملتی تھیں۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ خون جو لاش کی انگلیوں پر لگا ہوا تھا اور خون جو مسمی اطہر علی کے جسم سے لیا گیا، ایک ہی معلوم ہوتا ہے — میرا شک یقین میں بدل گیا۔ قاتل اطہر تھا۔ اب وہ میرے سامنے آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے حیرت اور خوف سے پوچھا — "جناب! میرا خون کیوں ٹیسٹ کیا گیا ہے؟"

"ابھی ہم تمہارا اور نہ جانے کیا کیا ٹیسٹ کریں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں
کہا تھا کہ یہ لاریوں یا چاریوں کا اڈہ نہیں، پولیس سٹیشن ہے۔"

"لیکن حضور والا، میرے ساتھ آپ سیدھی بات کریں۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"سنو دوست!" میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تمہاری گردن پر
زخم ہیں یہ لڑکی کے ناخنوں کے زخم ہیں اور اب تم پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو۔ سارا
بات خود بیان کر دو تاکہ میں شکریے کے طور پر تمہیں پھانسی کے تختے سے اتار لوں۔"

"ہاں حضور انور" — اس نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ لڑکی کے ناخنوں کے ز
ہیں لیکن لڑکی نے مجھے زخمی کیا ہے، میں نے اسے ہلکی سی ضرب بھی نہیں پہنچائی تھی۔ آ
مجھے پھانسی کے تختے پر کیوں کھڑا کر رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ تم نے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا ہے؟"

"میں نے مار دیا ہے؟" اس نے اچھل کر کہا۔ "خدا کی قسم، وہ زندہ ہے۔ میں آ
ساتھ لے جا کر دکھا سکتا ہوں۔ میں تو اس سے جان چھڑا کر بھاگا تھا۔ وہ تو چڑیل ہے۔"

میں سمجھا کہ خوف سے اس کا دماغ بگڑ گیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں مقتو
سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی تصحیح نہیں کی اور سوچا کہ اگر و
ہو گیا ہے تو بہتر ہے، دل کی باتیں اُگل دے گا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "وہ لڑکی کہاں

"دور نہیں ہے جناب والا" — اس نے جواب دیا۔ "ابھی میرے ساتھ چلیں
ہماری آبادی سے تقریباً آدھا میل دور اُن کے ڈیرے ہیں۔ اس کا نام ہاشو
بدبخت بہت خوبصورت لڑکی ہے۔"

"کون سے ڈیرے؟" — میں نے حیران سا ہو کے پوچھا۔ "کس کے ڈیرے؟"

"خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی بات کر رہا ہوں حضور والا" اس نے کہا۔ "میں ایک خانہ بدوش لڑکی کی بات کر رہا ہوں جس کا نام ہانشو ہے۔ اس ڈائن کو کون قتل کر سکتا ہے۔ وہ تو مجھے قتل کرنے لگی تھی۔ خدا کی قسم بڑی مشکل سے گردن چھڑا کر بھاگا ہوں۔"

میں نے غصے میں آ کر اسے گالی دی اور کہا۔ "میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جس کا نام زینب تھا اور جس کے رشتے کے لیے تم نے کوشش کی تھی اور جو کل رات قتل ہو گئی ہے۔ اس کی بات کرو۔ تمہارا دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں؟"

"قرآن لے آؤ حضورِ انور!"

"تم جیسے پلید آدمی کے آگے میں کلامِ پاک نہیں رکھوں گا۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تمہاری گردن پر زینب کے ناخنوں کے زخم ہیں۔"

"عالی جاہ!" اس نے کہا۔ "مجھے اجازت دیں کہ ساری بات سنا دوں۔ قرآن پاک کی قسم ہے، جھوٹ نہیں بولوں گا..." میرے کہنے پر اس نے جو بات سنائی وہ اس کے الفاظ میں مختصراً یوں ہے۔ "میری گردن پر یہ نشان ایک خانہ بدوش لڑکی کے ہیں۔ آپ خود جا کر یا اسے یہاں بلا کر پوچھ سکتے ہیں۔ زینب (مقتولہ) کے ساتھ تعلقات سے پہلے میری دوستی اس خانہ بدوش لڑکی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ میں اسے بہت مال کھلاتا رہا۔ وہ ایسی بُری طرح مجھ پر فقیر ہوئی کہ لاریوں کے اڈے پر بھی کبھی کبھی آ جایا کرتی تھی۔ پھر اس نے مجھے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ اس کے ساتھ شادی کر لوں۔ وہ انسان کی بچی نہیں، پوری حیوان ہے۔ یہ تو اس نے کئی بار کہا تھا کہ تم نے کسی دوسری لڑکی کی طرف نظر بھی اٹھائی تو تمہیں زندہ چھوڑوں گی نہ اسے۔ سچی بات ہے کہ میں اس سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ چونکہ خوبصورت تھی اس لیے میں اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں اس کے ساتھ شادی

کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس سے دور ہٹنے کی کوشش شروع کر دی اور زینب سے دوستی کر لی۔ یہ لڑکی بھی میری غلام ہو گئی۔ ہماری دوستی کا چرچا ہونے لگا۔ ہماری دوستی پاک صاف نہیں تھی۔ زینب کے باپ کو بھی پتہ چل گیا۔ اس نے ایک روز مجھے کہا کہ میں اس کی بیٹی سے ملنا چھوڑ دوں۔ میں نے اسے کہا کہ تم اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو۔ اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنی بیٹی کی شادی کسی آوارہ اور بدمعاش آدمی سے نہیں کروں گا۔ یہ سن کر مجھے طیش آ گیا اور میں نے اسے دھمکی دی۔۔۔

"اسے شاید معلوم تھا کہ اس کی بیٹی میری ہی طرح آوارہ اور بدمعاش تھی۔ مجھ سے پہلے تین نوجوان مردوں سے دوستی لگا چکی تھی۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ شادی کر لوں گا مگر اس نے مجھ سے پرے ہٹنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ یہ لیلیٰ مجنوں والی محبت تھوڑے ہی تھی کہ میں اس کا غلام ہو جاتا۔ میں اس دوران خانہ بدوش لڑکی سے نہ ملا۔ وہ دو دفعہ لاریوں کے اڈے پر آئی تو میں نے اسے ٹال دیا۔۔۔

"کل شام کی بات ہے کہ میں اڈے سے واپس آ رہا تھا کہ یہ خانہ بدوش لڑکی مجھے راستے میں مل گئی۔ میرے تعلقات زینب کے ساتھ ختم ہو چکے تھے۔ بیس پچیس روز سے اس نے ایک اور نوجوان کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ خانہ بدوش لڑکی مجھے راستے میں مل گئی تو میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ میں اسے دھتکار رہا ہوں۔ اس نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے گالیوں کا جواب گالیوں سے دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ لڑکی ہے ڈر جائے گی مگر وہ اور تیز ہو گئی۔ لوگ ہمیں دیکھنے لگے۔ میں اسے الگ لے گیا اور بتا دیا کہ میں اب اس سے نہیں ملا کروں گا اور وہ اب میرے پیچھے نہ آیا کرے۔۔۔

"وہ یکلخت آگ بگولا ہو گئی۔ میں چل پڑا تو اس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا اور بولی — "جاتے کہاں ہو، مجھے اپنے ساتھ لے چلو یا تم میرے ساتھ چلو" — وہ اب دانت پیس پیس کر بات کر رہی تھی۔ میں نے غصے سے پاگل ہو کر اس کی کلائی پکڑی اور اسے پرے کرتے ہوئے کہا — "میں اپنے ساتھ تجھ چڑیل کو لے جاؤں گا؟ کوئی اچھی لڑکی نہیں ملتی بھلا؟" ...

"اس نے اچانک دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑ لی اور اتنی زور سے دبائی کہ میرا دم گھٹ گیا۔ میں آخر مرد تھا۔ میں نے اس کے انگوٹھوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر زور سے پیچھے کو انگوٹھے کھینچے تو اس کے ہاتھ تو اکھڑنے لگے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری گردن دونوں طرف سے کاٹی جا رہی ہو۔ اس کے ناخن میری کھال میں اتر گئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ اکھاڑ دیئے اور اس نے میری کھال ادھیڑ لی۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ گر پڑی اور میں وہاں سے بھاگ اٹھا۔ میں بازار میں چلا گیا۔ گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ میری گردن کو پٹی میں کسنے لگا تو میں نے اسے کہا کہ پٹی نہ باندھو، صرف دوائی لگا دو۔ میں پٹی سے اس لیے ڈرتا تھا کہ ہر کسی کی نظر میں آ جائے گی اور سب پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے خون روک کر دوائی لگا دی اور بوتل میں بھی ڈال دی۔ کل سے میں بہت ڈرا ہوا ہوں۔ وہ چڑیل جہاں ملی مجھے پکڑ لے گی۔"

یہ لڑکی حیوان نہیں درندہ تھی!

میں نے اسی وقت ہیڈ کا[illegible]ں کو دو کانسٹیبل دے کر خانہ بدوشوں کے ڈیرے

کا اتا پتا بتا کر ہاشو نام کی لڑکی کو ٹھکانے میں لانے کے لیے بھیج دیا۔ بہت سے قارئین نے خانہ بدوش جنہیں جپسی کہتے ہیں، نہیں دیکھے ہوں گے۔ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے قریب آپ نے ایک مخلوق دیکھی ہو گی جو خیموں میں رہتی ہے۔ یہ لوگ تھوڑا عرصہ ایک جگہ رہ کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے غلیظ کپڑوں کے ٹکڑے اکٹھے کرتے رہتے ہیں اور انہیں نہروں یا دریاؤں میں دھو کر فیکٹریوں میں تول کر بیچتے ہیں۔ یہ کپڑے مشینیں صاف کرنے کے کام آتے ہیں۔ ان کی جوان عورتیں شہروں میں بھیک بھی مانگتی ہیں۔ چوریاں بھی کرتی ہیں اور عصمت فروشی بھی کرتی ہیں۔ انہیں لوگ خانہ بدوش کہتے ہیں لیکن یہ اُن خانہ بدوشوں سے بہت مختلف ہیں جو ہمارے زمانے میں دیکھنے میں آتے تھے۔ آج کل کے خانہ بدوش جو آپ کو شہروں کے اردگرد نظر آتے ہیں، یہ دراصل بھکاری اور مزدور ہیں۔ اصلی خانہ بدوش ایک پُراسرار مخلوق ہوا کرتی تھی۔

ان خانہ بدوشوں کا ایک گروہ دس دس بارہ بارہ کنبوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان کے پاس چند ایک گدھے اور ایک دو چھپریں ہوتی تھیں۔ ان کے خیمے اوپر سے گول ہوتے تھے جو چاند کی شکل کے بانسوں پر کھڑے کیے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ تین چار کتے ضرور ہوتے تھے جو بھیڑیئے لگتے تھے۔ بڑے ہی خونخوار کتے ہوا کرتے تھے۔ یہ رکھوالی کے لیے ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو چوری چکاری کا تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ چونکہ جنگلوں میں رہتے تھے اس لیے درندوں سے بچاؤ کے لیے بھیڑیوں کی نسل کے خونخوار کتے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا کوئی کتابی مذہب نہیں تھا۔ وہ گیدڑ مار کر کھا لیا کرتے تھے۔ نیولے اور اُودھ بلاؤ تک کو کھا لیتے تھے۔ پرندوں میں چیل اور گدھ بھی ان کی غذا میں شامل تھے۔

ان کی عورتیں جفاکش، طاقتور اور خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوگ بھیک نہیں مانگتے تھے اور نہ ان کی عورتیں عصمت فروشی کرتی تھیں۔ لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ شہروں سے بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں اور انہیں الٹا لٹکا کر نیچے آگ جلاتے ہیں تھوڑی دیر بعد بچے کے سر میں سے قطرے گرنے لگتے ہیں جسے مومیائی کہا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ مومیائی ہر مرض کی دوا ہے اور انسان کے جسم کو فولاد بنا دیتی ہے۔ بعض لوگ انہیں آدم خور بھی سمجھتے تھے۔ ان کے متعلق بڑی خوفناک اور پُراسرار کہانیاں مشہور تھیں۔

ان کی عورتوں کی ڈیل ڈول اور خوبصورتی بھی پُراسرار سی ہوتی تھی۔ اگر کوئی شہری کسی خانہ بدوش عورت کو چھیڑ بیٹھے تو وہ مرنے مارنے پر اتر آتی تھی۔ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ عورتیں شہروں میں چھریاں اور چاقو بیچنے آیا کرتی تھیں۔ بہت دلیر عورتیں تھیں اور اگر کوئی خانہ بدوش عورت کسی شہری پر نظر رکھ لے تو اسے اپنے قبضے میں لے کر ہی دم لیتی تھی۔ مگر ایسے واقعات بہت کم دیکھنے میں آتے تھے۔ میرے مشتبہ اطہر علی نے جب مجھے ایک خانہ بدوش لڑکی کا واقعہ سنایا تو میں بالکل حیران نہیں ہوا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ مقتولہ کو قتل کرنے والی یہی لڑکی ہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر میں نے اطہر سے پوچھا۔

"اس لڑکی نے زینب کو دیکھا تھا؟ وہ جانتی تھی کہ تم نے اب زینب سے دوستی کرلی ہے؟"

"نہیں"۔ اطہر نے جواب دیا۔ "اس نے زینب کو کبھی نہیں دیکھا تھا"۔

میں اطہر سے باتیں پوچھتا اور سنتا رہا۔ اس سے اس نوجوان کا بھی اتا پتا معلوم کیا جس کے متعلق اس نے بتایا تھا کہ زینب نے دوستی کرلی ہے۔ دو اڑھائی گھنٹوں بعد ہیڈ

کانسٹیبل خانہ بدوش لڑکی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور دو عورتیں تھیں
میں نے انہیں باہر والے پھاٹک سے اندر آتے دیکھا تو کمرے سے نکل کر ان تک گیا۔
انہیں میں نے تسلی دی کہ وہ کوئی فکر نہ کریں۔ کوئی خطرناک بات نہیں ہے۔ لڑکی
ایک واردات کے سلسلے میں گواہی لینی ہے۔ وہ بہت پریشان تھے لیکن الٹا لڑکی مجھے
رہی تھی۔ وہ واقعی خوبصورت اور بڑے ہی دلکش جسم والی لڑکی تھی۔ میں نے اس کے سا
آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کو پھاٹک کے قریب بٹھا دیا اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے
اطہر میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

لڑکی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اپنی میز سے گھوم کر اپنی کرسی پ
بیٹھ رہا تھا جب لڑکی کی نظر اطہر پر پڑی۔ مجھے لڑکی کے چہرے کے تاثرات آج تک یا
ہیں۔ اس کا رنگ اچھا خاصا تھا مگر یہ رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ غصے سے لمبے لمبے سانس
لگی۔ اس کی نظریں اطہر پر جمی ہوئی تھیں۔ اطہر اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے دا
پیس کر بڑی غلیظ گالی دی اور بولی ——" اسے میں مرد کی اولاد سمجھتی تھی۔ یہ اب مجھ
قید کرائے گا"

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا ——" مجھے قید کر لو۔ اس کو میں نے زخمی کیا تھا لیکن میں
تھوڑی سی قید نہیں لوں گی۔ بہت ساری لوں گی" —— یہ کہہ کر وہ زخمی بلی کی طرح اس ت
تیزی سے اطہر پر جا پڑی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں اطہر کے سر کے
بال پکڑ لیے۔ دوسرا ہاتھ اس کی شہ رگ پر رکھ دیا اور دانت اس کے گال میں گاڑ دیے۔ ا
جیسے تنومند آدمی کی چیخ نکل گئی۔ وہ بلبلا کر اٹھا۔ لڑکی نے اس کی گردن کو ایسا مروڑا دیا
وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ لڑکی اس کے اوپر گری۔ لیکن اس نے نہ اس کے بال چھوڑے نہ گا

سے دانت اکھاڑے۔ میں پہنچ تو گیا جس میں زیادہ سے زیادہ دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ اتنی دیر میں لڑکی اسے گرا چکی تھی۔

میں نے لڑکی کو کمر سے پکڑ کر اٹھانے کے لیے زور لگایا مگر اس کے دانت اطہر کے گال میں اترے ہوئے تھے اور لڑکی اسے بھیڑیئے کی طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ میرے دو کانسٹیبل اندر آ گئے۔ میں نے لڑکی کی ناک دبا لی اور دوسرا ہاتھ اس کی شاہ رگ پر رکھ کر دبایا۔ دم گھٹنے سے لڑکی کا منہ کھل گیا۔ ہم نے اسے قابو کر لیا لیکن وہ ہمارے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے حوالات میں بند کرنے کی دھمکی بھی دی مگر اس نے کہا کہ میں پھانسی لے لوں گی، اسے ختم کر دوں گی۔ اطہر کا گال دیکھا۔ اس کی بوٹی باہر آ گئی تھی۔ خون اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔ میں نے اسے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ہسپتال بھیج دیا۔ اس کا اتنا تندرست اور خوبصورت چہرہ ہمیشہ کے لئے بھدا ہو گیا۔ قتل کا یہ کیس جب عدالت میں گیا تو میں نے اطہر کو دیکھا۔ اس کا زخم ٹھیک ہو گیا تھا لیکن زخم کا نشان ایسا بھدا تھا کہ دیکھنے والا فوراً نگاہیں ہٹا لیتا تھا۔ آنکھ کے ذرا نیچے سے ہونٹوں کے کونے تک یعنی ایک طرف سے چہرہ بُری طرح بے ڈھب ہو گیا تھا۔ اس کے اسی چہرے پر لڑکیاں مرا کرتی تھیں۔

اسے ہسپتال بھیجا تو میں نے لڑکی کو بڑی ہی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ اسے یہ وہم تھا کہ اطہر نے اس کے خلاف رپورٹ کی ہے اس لیے اسے تھانے بلایا گیا ہے۔ میں نے اس کا یہ وہم دور کیا اور بتایا کہ ایک لڑکی قتل ہو گئی ہے۔ یہ اطہر کی دوست تھی۔ اس کی تفتیش کے لیے اسے بلایا گیا ہے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا ــــ "اسے کل تم نے زخمی کیا تھا؟" ــــ اس نے قہر سے جواب دیا ــــ "ہاں، میں نے کیا تھا۔ میں اسے

قتل کرنا چاہتی تھی۔"

اس لڑکی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب سا اثر ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ اطہر کے خو
سے لال تھے۔ خون اس کے منہ میں چلا گیا تھا۔ زبان بھی لال تھی۔ ناک پر بھی خون تھا
اس کے ہونٹوں کے ارد گرد نیچے ٹھوڑی تک خون تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے ا
کا کچھ خون پی بھی لیا ہوگا۔ وہ مجھے ایک حسین چڑیل نظر آ رہی تھی جو انسانوں کو کھاتی
اطہر نے کہا تھا کہ یہ لڑکی حیوان ہے لیکن میری نظر میں وہ درندہ تھی۔ میں نے اسے کہا
منہ صاف کر لو۔ اس نے بڑے غصے سے اپنا بازو اپنے ہونٹوں پر مل دیا جس سے خو
اس کے چہرے پر اور زیادہ پھیل گیا۔

"اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا بگاڑا ہے؟" اس نے شدید غصے کے لہجے میں جواب دیا ۔۔۔ "اس نے مجھے لو
لیا ہے۔ یہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ شادی کروں گا
مجھ کو پیسے دیتا تھا۔ میں نے اس کو اپنی عزت دے دی۔ وہ میرے ساتھ کھیلتا رہا۔
نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ یہ میرا خاوند بننے والا تھا۔ میں نے اپنے باپ سے مار کھائی
لیکن اس آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پھر اس نے مجھ کو دھوکا دیا اور مجھ سے بھاگنے لگ
میں اس کو عزت دے چکی تھی۔ میں نے اس کو کہا کہ تم میرے خاوند بن گئے ہو۔ اب کد
جاتے ہو۔ اس نے کہا کہ تم جنگلی ہو۔ میں شہر کی لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا۔ میں نے
سے پوچھا کہ شہر کی لڑکی کون ہے؟ اس نے نہیں بتایا۔ اگر بتا دیتا تو میں اس کو جان سے
مار دیتی اور اس آدمی کو بھی۔ یہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب مجھ کو قید کر لو۔"

میں اسے قید کر سکتا تھا۔ اس نے تھانے میں ایک آدمی پر حملہ کر کے اسے ز

کردیا تھا لیکن اس نے جس وجہ سے حملہ کیا تھا وہ معقول وجہ تھی۔ اس نے کسی بے گناہ پر حملہ نہیں کیا تھا لڑکی کا استعمال بیجا تھا۔ میں نے لڑکی کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس سے یہی تصدیق کرائی تھی کہ اطہر کی گردن پر جو خراشیں ہیں وہ اسی لڑکی کی ہیں۔ میں نے لڑکی کے ساتھ آئے ہوئے مردوں کو بلا کر کہا کہ اس لڑکی کو قابو میں رکھو۔ انہیں بتایا کہ اس نے کیا کیا ہے اور یہ بھی کہا کہ میں اسے حوالات میں بند کر سکتا ہوں۔ اگر اس نے کوئی اور ایسی حرکت کی تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ دوسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ خانہ بدوش اس شہر سے چلے گئے ہیں۔

میں نے مقتولہ کی ماں کو ایک بار پھر بلایا۔ چند ایک چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھنی تھیں۔ اب تو میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ باپ پر قتل کا شبہ تھا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ اطہر کو دیکھا تو میں نے اسی کو قاتل سمجھا مگر یہ کچھ اور ڈرامہ نکلا۔ اطہر کو میں نے مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال کر گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ لڑکی کے چال چلن کے سلسلے میں اس کی گواہی ضروری تھی۔ اب میں پھر اس لائن پر آ گیا کہ مقتولہ کا قاتل اس کا باپ تھا۔ کچھ معلومات ابھی اندھیرے میں تھیں۔ مقتولہ کی ماں کے سوا مجھے کوئی بھی روشنی نہیں دکھا سکتا تھا۔ میں نے اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا ـــــ "تمہارا خاوند مر چکا ہے۔ اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اپنی بیٹی کو اس نے قتل کیا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہے یا قاتل کو پکڑنا ہے۔ تم اُس روز سے جس روز تمہارے خاوند کو پتہ چلا تھا کہ بیٹی خراب ہو گئی ہے، قتل کی شام تک چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کرو اور مجھے بتاؤ"ـــــ میں نے اس مظلوم اور غمزدہ عورت کو کھانا کھلایا۔ چائے پلائی اور اس کے دل سے پولیس کا خوف نکال دیا۔ وہ مجھے چھوٹی بڑی باتیں سنانے لگی۔ میں بڑے غور

سے سنتا رہا اور سوال کرتا رہا۔

ایک ماں ایک معمہ

شاید تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ میں نے اتنی طویل گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا کہ بیٹی کا قاتل باپ ہی تھا۔ وہ اپنی بیوی کو اکثر کہا کرتا تھا کہ اپنی لڑکی کو یا تو موت آجائے یا اسے اپنے ہاتھوں ختم کر دیا جائے۔ دو مرتبہ اس نے کہا تھا کہ میں کوئی ایسا زہر تلاش کرتا ہوں جو اپنا کام بھی کر جائے اور کسی کو شک بھی نہ ہو۔ لڑکی کا گلا باپ نے چار مرتبہ دبایا تھا۔ ان باتوں سے یقین پختہ ہونے لگتا تھا کہ باپ اپنی لڑکی کو قتل کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا اور ماں رو رو کر پاگل ہوتی رہتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو سمجھاتی بجھاتی رہتی اور اسے باپ سے بچانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ مگر مجھے ایسی کوئی شہادت نہیں مل رہی تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ کیا باپ کو معلوم تھا کہ لڑکی فلاں وقت باہر نکلے گی اور وہ اس کی گھات میں بیٹھا ہوا تھا؟ کام سے تو وہ جلدی آ گیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ وہ کرم سنگھ کے ٹھیکے پر چلا گیا تھا۔

کرم سنگھ سے میں نے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس آدمی کو اس نے اُس وقت ٹھیکے میں بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا جب سارے گاہک جا چکے تھے اور وہ اکیلا پڑا رہ گیا تھا۔ کرم سنگھ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے ٹھیکے میں کس وقت داخل ہوا تھا۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بیٹی کو قتل کر کے شراب خانے میں گیا تھا۔ بہرحال یہ شبہ تھا یا یقین، ثبوت کوئی نہیں تھا۔ میرے لئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں یہ رپورٹ لکھ دوں کہ قاتل نے خودکشی کر لی ہے۔

مقتولہ کی ماں نے نئی بات یہ بتائی کہ پہلے اطہر کو پسند کرتی تھی پھر اس نے قتل سے کچھ دن پہلے ایک اور لڑکے کا نام لینا شروع کر دیا تھا۔ ماں کو وہ کہتی تھی کہ یہ لڑکا بہت ہی شریف ہے۔ ماں نے لڑکے کو دیکھا۔ لڑکی اس سے ملتی رہتی تھی۔ ماں نے لڑکی سے کہا کہ ہم خود بات کرتے اچھے نہیں لگتے۔ لڑکے سے کہو کہ وہ اپنی ماں کو میرے پاس بھیجے لیکن لڑکے کی ماں نہیں آئی۔ اتنے میں لڑکی قتل ہو گئی ــــ میں نے مقتولہ کی ماں سے پوچھا کہ یہ بات اس نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ اس نے جواب دیا کہ بات ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی اس لیے اس نے اس کا ذکر کرنا بیکار سمجھا۔

میں نے سوچا کہ اس لڑکے سے بھی پوچھ گچھ کر لی جائے۔ ہو سکتا ہے اس کے اور اطہر کے درمیان یا مقتولہ کے کسی اور دوست کے ساتھ رقابت چل پڑی ہو اور اس کا شکار لڑکی ہوئی ہو۔ میں نے مقتولہ کی ماں سے اس لڑکے کا اتا پتا پوچھا، تو یہ وہی نوجوان نکلا جس کے متعلق مجھے اطہر بتا چکا تھا اور ایک اور آدمی نے بھی بتایا تھا کہ رات اس نے مقتولہ کو اس نوجوان کے ساتھ بغل گیری کی حالت میں دیکھا تھا۔ اس کے متعلق پتہ چلا کہ ایک کارخانے میں رات کی شفٹ میں کام کرتا ہے۔

میں نے اسے تھانے بلوا لیا۔ وہ بیس بائیس سال کی عمر کا جوان تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کا بھولپن تھا۔ چہرے پہچاننے کے تجربے کی بنا پر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ لڑکا قاتل نہیں ہو سکتا قتل ہو سکتا ہے۔ وہ ڈرا ہوا ضرور تھا لیکن اس نے بولتے وقت ذرہ بھر جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہ کیا ــــ "مقتولہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کب سے تھے؟" ــــ اس نے سوچ کر جواب دیا ــــ "میرا خیال ہے ابھی ایک مہینہ پورا نہیں ہوا تھا" ــــ میں نے پوچھا ــــ "قتل کی رات تم کہاں تھے؟" ــــ اس نے جواب دیا۔

"میں ورکشاپ میں چلا گیا تھا۔ صبح پتہ چلا کہ زینب قتل ہو گئی ہے۔"

"تمہیں وہ آخری بار کب ملی تھی؟"

"اسی شام۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھ سے مل کر وہ گھر نہیں جا سکی۔ میں ورکشاپ کی طرف چلا گیا تھا اور وہ وہیں کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھی۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ لڑکی کی دوستی کچھ اور مردوں کے ساتھ بھی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "کبھی ایسا ہوا ہے کہ ان میں سے کسی نے تمہیں ڈرایا دھمکایا ہو؟"

"مجھے معلوم تھا کہ لڑکی پاک نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "پھر بھی میں نے اسے پسند کیا۔ مجھے کسی نے کبھی ڈرایا دھمکایا نہیں تھا۔"

"لڑکی نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ کوئی آدمی، خصوصاً اطہر نام کا ایک آدمی اسے دھمکیاں دیتا ہے یا اسے تم سے ملنے سے روکتا ہے؟"

"کبھی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اس لڑکی کے ساتھ میرے تعلقات ویسے نہیں تھے جیسے دوسروں نے اس کے ساتھ رکھے تھے۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ میری محبت پاک رہے گی۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے اس لڑکے سے جس کا نام اکمل تھا، کچھ ایسی باتیں پوچھیں جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ نہیں بتائے گا یا جھینپ جائے گا لیکن اس نے بلا جھجک ہر ایک بات بتا دی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں اور نہ اسے کوئی خطرہ ہے۔ میں نے سوال کرنے کی بجائے اسے کہا کہ وہ اپنے متعلق، لڑکی کے متعلق اور دیگر تمام باتیں جو اس کے ذہن میں آئیں مجھے سنا دے۔ اس نے اپنی تمام زندگی کی جو کہانی سنائی وہ اس کے الفاظ میں اس طرح ہے:

اس نے ہمارے شہر سے کوئی ایک سو دس میل دور کے ایک اور شہر کا نام لے کر کہا۔ "میں اس شہر میں پیدا ہوا تھا۔ باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری عمر کیا تھی۔ میری عمر نو دس سال ہوئی تو ایک روز ایک عورت آئی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور منہ چوم چوم کر مجھے پریشان کر دیا۔ میں اُس وقت تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ یہ عورت آئی تو مجھے بتایا گیا کہ یہ تمہاری ماں ہے اور اب تم اس کے ساتھ رہو گے۔ میں بہت حیران ہوا۔ میں تو اس عورت کو اپنی ماں سمجھتا تھا جس نے مجھے پالا تھا۔ میں نے ہوش اس عورت کی گود میں سنبھالا تھا۔ میرے بعد اس عورت کے دو بچے پیدا ہوئے جنہیں میں اپنے بھائی سمجھتا تھا۔ گھر میں جو آدمی تھا اسے میں ابا کہا کرتا تھا۔ اس عورت کے آنے کے بعد مجھے ان دونوں عورتوں نے پاس بٹھا کر بتایا کہ جس عورت نے مجھے پالا ہے وہ میری خالہ ہے اور یہ عورت جو اچانک کہیں سے آ گئی ہے میری ماں ہے اور میرا باپ اُس وقت مر گیا تھا جب میں ڈیڑھ سال کا تھا۔ یہ معمّہ مجھے سمجھ نہ آیا تو میں رو پڑا۔ یہ عورت ہمارے گھر میں رہنے لگی۔ وہ میرے ساتھ پاگلوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ رات مجھے اپنے ساتھ سلاتی تھی۔ سکول سے چھٹی کے وقت وہ سکول سے باہر کھڑی ہوتی اور میرا بستہ اٹھا لیتی . . . .

"میں نے تسلیم کر لیا کہ یہ واقعی میری ماں ہے۔ خالہ نے میرے ساتھ اتنا پیار کبھی نہیں کیا تھا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ جب ماں نے مجھے دیوانہ وار پیار دیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس سے پہلے میں پیار سے محروم رہا ہوں۔ یہ بات پیار نے میرے دل میں پکّی کر دی کہ یہ عورت میری ماں ہے اور جس نے مجھے پالا ہے وہ خالہ ہے اور اس کا خاوند میرا باپ نہیں۔ میں چونکہ بچّہ تھا اس لیئے اس کے پیار میں الجھ گیا۔ یہ سوال میرے دماغ میں آیا ہی نہیں کہ ماں سے پوچھوں

کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہی ہے . . . .

"میں نے تیسری جماعت پاس کر لی تو ماں مجھے اسی شہر میں اسی طرح کے ایک کچے مکان میں لے گئی جس کا ایک ہی کمرہ تھا۔ ہم غریب لوگ تھے۔ میری خالہ کا خاوند مستری تھا۔ ماں نے ایک گھر میں نوکری کر لی اور مجھے پالنے اور پڑھانے لگی۔ میں بڑا ہوتا گیا اور یہ سوال میرے دماغ میں ابھرتا گیا کہ ماں اتنا عرصہ کہاں رہی مگر پوچھنے کی معلوم نہیں کیوں جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ماں سوائے پیار کے اور کوئی بات کرتی ہی نہیں تھی۔ میں نے ایک بار اس سے اپنے باپ کے متعلق پوچھا تو اس نے حقارت سے جواب دیا ـــ "اس مردود کا نام نہ لو۔ بہت برا آدمی تھا۔ اچھا ہوا کہ مر گیا۔ زند ہوتا تو ہم دونوں کو مارتا پیٹتا ہی رہتا" ـــ اس کے بعد بھی اس نے میرے باپ کے متعلق ایسی ہی بری بری باتیں سنا کر میرے دل سے باپ کی یاد نکال دی . . . .

"میں نے آٹھ جماعتیں پاس کر لیں تو ماں نے مجھے خالہ کے خاوند کے حوالے کر د اس نے مجھے اس ورکشاپ میں جہاں وہ ملازم تھا مجھے موٹر مکینک کا کام سکھانا شروع کر د مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ دو سال بعد مجھے آٹھ آنے روز ملنے لگے۔ یہ تنخواہ مجھے ایک سال ملتی رہی۔ میری عمر بیس سال ہو چکی تھی۔ ایک روز میری خالہ اور اس کا خاوند ہمار گھر آئے۔ ماں نے مجھے کسی کام سے باہر بھیج دیا۔ میں جب واپس آیا تو خالہ نے مجھے کہا ک کل ورکشاپ میں نہ آنا۔ میں تمہیں اور جگہ نوکری دلا رہا ہوں۔ میں نے وجہ پوچھی تو مجھے ٹالنے کے لیے ایسی وجہ بتائی گئی جو میری سمجھ میں نہ آئی"۔

میں اس نوجوان کی اتنی لمبی کہانی نہیں سننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اپنے متعلق اور لڑکی کے متعلق کچھ بتاؤ۔ اس نے اتنی لمبی کہانی شروع کر دی۔ میں نے اسے روکا

نہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس لڑکے نے مجھے کچھ متاثر کر لیا تھا ورنہ ہم مشتبہ افراد سے جنہیں ہم شامل تفتیش کرتے ہیں صرف وہ باتیں پوچھتے ہیں جو نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ ہم بولنے کا موقع صرف اسے دیتے ہیں جس کے سینے سے کوئی بات نکلوانی ہوتی ہے۔ اس لڑکے نے پیدائش سے اپنی کہانی شروع کر دی۔ میرے دل میں آئی کہ اسے روک دوں اور اپنے مطلب کی بات پر لے آؤں لیکن اس نے جب اپنی ماں کے متعلق بتایا کہ وہ اتنا عرصہ بعد اچانک آگئی اور اس بچے کو قبضے میں کر لیا اور بچے کے باپ کے خلاف بچے کے دل میں نفرت پیدا کی تو میرے اندر پولیس مَین کا تجسس بیدار ہو گیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ عورت اس کی ماں ہی تھی یا یہ کوئی فراڈ تھا۔ اس کے علاوہ مسلسل تفتیش کرتے کرتے میرا دماغ تھک گیا تھا اس لیے بھی میں نے سوچا کہ چلو، یہی کہانی سن لو، دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ نوجوان میرے لیے رحمت کا فرشتہ ہے۔

اس نے کچھ اور باتیں سنا کر کہا۔ "ماں مجھے یہاں لے آئی۔ خالو بھی ساتھ آیا تھا۔ یہاں ورکشاپ میں مجھے اسی نے ملازمت دلائی اور اس آبادی میں ایک کمرے کا ایک مکان کرائے پر لے دیا پھر وہ چلا گیا۔ ہم یہاں سات آٹھ مہینوں سے رہ رہے ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ مہینے سے میں رات کی پہلی شفٹ میں کام کرتا ہوں۔"

"ماں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتایا کہ وہ تمہاری دس سال کی عمر تک کہاں رہی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ایک روز میں اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے بتایا کہ وہ کسی اور شہر میں رہتے تھے جہاں میرا باپ مر گیا۔ مکان پر میرے ایک چچا نے قبضہ کر لیا۔ میری ماں نے مجھے خالہ

کے حوالے کر دیا اور خود محنت مزدوری کر کے میرے لیے خرچ بھیجتی رہی۔ مگر میری تسلّی نہ ہوئی۔ وہ کبھی تو آتی اور مجھے دیکھ جاتی۔ اس سے پہلے وہ مجھے دیکھنے کبھی بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اس پر زور نہیں دیا کہ مجھے ضرور بتائیے۔ اس کے پیار کا اثر ایسا ہے کہ میں اس سے پرانی باتیں پوچھ کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ آپ جب تک اسے دیکھ نہ لیں یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کس طرح چاہتی ہے۔ کئی بار مجھے شک ہوا کہ یہ عورت پاگل ہے بلکہ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس عورت نے اپنے پیار کا قیدی بنا رکھا ہے۔ مجھے اس قید میں لطف آتا ہے.....

"اس دوران زینب (مقتولہ) کے چرچے سنے کہ دوستی کرنے کی عادی ہے اور بدنام لڑکی ہے۔ میں اسے دیکھا کرتا تھا۔ بدنام ہونے کے باوجود وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ کچھ عرصہ وہ مجھے دیکھتی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ ایک بار وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ یہ تقریباً ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ اس کی مسکراہٹ نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ ہم فوراً ملے اور ہمارا تعلق گہرا ہو گیا میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہماری محبت پاک تھی۔ یقین کریں کہ اس لڑکی نے مجھے کبھی اشارے سے بھی بدی کی طرف مائل نہیں کیا۔ میں شام ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتا ہوں اور رات بارہ بجے ورکشاپ سے آتا ہوں۔ وہ جس جگہ قتل ہوئی ہے وہاں شام کو میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ میں تھوڑی سی دیر اس کے پاس رک کر ورکشاپ چلا جایا کرتا تھا.....

"ہم نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ شادی کریں گے۔ دراصل میں بدی کے صرف نام سے واقف تھا ماں نے میرے اندر صرف پیار بھرا تھا۔ میرے پاس پیار تھا۔ سچا پیار جس میں خلوص تھا۔ یہ پیار لڑکی کو پہلی بار ملا تھا۔ یہاں ایک معاملہ الٹا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ لڑکیوں کو باہر نکلنے اور لڑکوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان پر پابندی عائد ہوتی ہے مگر یہاں عالم یہ تھا کہ لڑکی

کھلے بندوں باہر جاتی اور میرا انتظار کرتی تھی اور میں ماں کے ڈر سے کھلے بندوں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ سارا دن چھٹی ہوتی تھی۔ میں باہر نکلنا چاہوں تو میری ماں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ میں باہر نہ نکلوں۔ اگر وہ غصے یا حکم سے روکتی تو میں باغی ہو جاتا۔ وہ مجھے پیار سے روکتی تھی۔ میں ضد کروں تو رونے لگتی تھی۔ باہر جانے کے لیے وہ میرا صرف ایک بہانہ مان لیتی ہے۔ یہ ہے سینما۔ میں اسے کہتا ہوں، ماں رات کو میں کام کرتا ہوں، دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ سینما دیکھنے سے دل بہل جاتا ہے۔ وہ مجھے پیسے دیتی ہے اور یہ ہدایت ضرور دیتی ہے کہ بیٹا، سڑک سے ہٹ کر چلنا۔ آگے پیچھے دیکھ کر چلنا۔ چونکہ میرا یہ بہانہ ماں کے لیے قابل قبول تھا۔ اس لیے تین سے ساڑھے چھ بجے تک میں سینما کے بہانے سے زینب کے ساتھ وقت گزار لیا کرتا تھا لیکن ایسی ملاقاتیں صرف تین ہوئیں۔
وہ دلیر لڑکی تھی۔ جہاں کہتا وہاں پہنچ جاتی تھی۔۔۔۔

مقتولہ محبت کی قیمت دیتی رہی

"ایسی ہی لمبی ملاقاتوں میں اس نے میرے ساتھ دل کی باتیں کیں۔ وہ ان پڑھ لڑکی تھی اور ایک غریب باپ کی بیٹی۔ اس کا بچپن غربت اور فاقوں میں گزرا۔ اس کا باپ سارا دن مزدوری کرتا اور بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی پوری ہوتی تھی۔ کچھ عرصے سے اُس نے باورچی کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس سے بڑا ایک بھائی تھا۔ وہ مر گیا۔ اس سے چھوٹا بھائی بھی مر گیا۔ پھر ایک بھائی پیدا ہوا وہ بھی مر گیا۔ صرف یہ لڑکی بچی اور جوان ہوئی۔ ماں اس سے کچھ پیار کرتی تھی، باپ اسے منحوس سمجھتا تھا۔ زینب نے مجھے بتایا تھا کہ باپ اس کے ساتھ کئی کئی دن بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ کہا تھا کہ

لڑکوں کی جگہ یہ مرجاتی تو اچھا تھا۔ وہ بچپن کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ جب باپ اسے مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے سنایا ”میں گھر سے باہر خوش رہا کرتی تھی۔ جب جوان ہونے لگی تو مجھے لڑکے زیادہ اچھے لگنے لگے۔ وہ محبت کی باتیں کرتے تھے اور میں محبت کی پیاسی تھی۔ اس پیاس نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ میں ہر کسی کے دھوکے میں آجاتی تھی۔ میں محبت کی قیمت دینے کے لیے اپنا جسم پیش کر دیا کرتی تھی۔ باپ کو پتہ چل گیا۔ اس نے کئی بار میرا گلا گھونٹ دیا۔ کبھی ماں چھڑا لیتی تھی اور کبھی پڑوسی۔ اگر مجھے یہی محبت باپ سے مل جاتی تو میں اس طرح گمراہ اور خوار نہ ہوتی“۔ . .

”مجھ سے اسے وہ محبت مل گئی جو اسے باپ سے نہیں مل سکی تھی۔ اس نے پاک اور ناپاک میں فرق دیکھ لیا تو اسے اُن آدمیوں سے نفرت ہو گئی جو اس کے جسم کے ساتھ کھیلتے رہے تھے۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر رو دیا کرتی تھی۔ جناب، میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نیک انسان ہوں۔ بات یہ تھی کہ میرے سینے میں ماں کا پیار تھا جو میں نے زینب کو دیا۔ میں نے جب اسے کہا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا تو اس نے پوچھا ”یہ جانتے ہوئے کہ میں گناہگار اور ذلیل ہوں، تم مجھ سے شادی کر لو گے؟“۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں نے نیکی کی خاطر اسے جواب دیا کہ تم جیسی کیسی بھی ہو میں تم سے شادی کر لوں گا یا اس لیے کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ تم اپنی ماں سے کہو کہ میری ماں سے ملے اور بات کرے۔ ایک روز اس نے مجھے کہا کہ اس نے اپنی ماں سے بات کی ہے اور ماں نے کہا ہے کہ تم اپنی ماں سے کہو کہ ہم سے رشتہ مانگے۔ دراصل دستور تو یہی ہے۔ میں نے زینب سے کہا کہ تم میری ماں سے بھی ملا کرو تاکہ وہ تمہیں پسند کرنے لگے . . . .

”وہ دوسرے ہی دن میری موجودگی میں ہمارے گھر آئی۔ میری ماں کی یہ عادت ہے

کہ بالکل خاموش رہتی ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ اس کا میل جول نہیں کہیں کوئی مر جائے، کسی کی شادی ہو، میری ماں کسی کے ہاں نہیں جاتی۔ اس کی ساری دنیا صرف میں ہوں۔ زینب ہمارے گھر آئی تو ماں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ زینب میرے ساتھ باتیں کرنے لگی اور میں اس کے ساتھ باتوں میں مگن ہو گیا۔ اچانک ماں نے غصے سے کہا ــــ ''اکمل! تم اندر جا کے بیٹھو'' ــــ میں اندر چلا گیا۔ زینب نے میری ماں کے ساتھ کوئی بات شروع کی تو ماں نے اسے کہا ــــ ''تم جاؤ لڑکی، یہاں نہ آیا کرو'' ــــ مجھے یقین ہو گیا کہ ماں کو بالکل علم نہیں تھا کہ زینب کیسی لڑکی ہے۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ تمہیں ملنے آئی تھی اور تم نے اس کے ساتھ بات ہی نہیں کی بلکہ اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ماں نے چونک کر مجھ سے پوچھا ــــ ''تم کس طرح جانتے ہو کہ وہ اچھی لڑکی ہے؟ تم اسے ملتے رہے ہو اسی لیے وہ تمہارے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی'' میں نے ماں کو بتا دیا کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں . . .

''ماں کتنی ہی دیر مجھے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ میں نے اسے اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو پیار کا مجسمہ تھی مگر اس کے چہرے سے وہ رنگ ہی اڑ گیا جس میں پیار ہوتا ہے۔ اس نے آہ بھری اور پرے چلی گئی۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ میں شام کو کام پر جانے لگا تو ماں نے مجھے کہا ــــ ''آئندہ تم اس لڑکی سے نہیں مل سکتے'' ــــ مجھے شک ہوا کہ ماں کو پتہ چل گیا ہے کہ لڑکی بدنام ہے۔ میں نے کہا کہ ماں، یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ماں نے مجھے بولنے نہ دیا۔ حکم کے لہجے میں بولی ــــ ''مجھے بالکل پتہ نہیں کہ وہ کیسی لڑکی ہے میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم کسی بھی لڑکی سے نہیں مل سکتے۔ تمہاری شادی کا فیصلہ میں کروں گی۔ تم فیصلہ نہیں کر سکتے'' . . .

"میں چپ چاپ باہر نکل گیا۔ میں ماں کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا مگر زینب کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اسے ملتا رہا۔ ایک روز میں نے سینما جانے کا بہانہ کیا تو ماں نے اجازت نہ دی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں روکا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا "ماں، میں اب بچہ نہیں ہوں۔ میں جا رہا ہوں" ۔۔۔ اور میں چلا گیا۔ زینب کو میں نے ایک جگہ بتا رکھی تھی، وہ آ گئی اور ہم چھ بجے تک باتیں کرتے رہے۔ گھر آیا تو ماں نے کچھ بھی نہ کہا لیکن اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔۔۔

یہ ماں قاتل نہیں ہو سکتی

"ایک روز میرے کہنے پر زینب کی ماں میری ماں کے پاس آئی۔ میں گھر تھا۔ زینب کی ماں نے اپنا تعارف کرایا تو میری ماں نے کہا ۔۔۔ "اپنی بیٹی سے کہہ دینا کہ میرے لڑکے سے نہ ملا کرے۔ میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گی" ۔۔۔ وہ بے چاری پریشان سی ہو کر چلی گئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ماں پر برس پڑا۔ اس سے پہلے میں ماں سے ایسی بدتمیزی سے کبھی نہیں بولا تھا۔ میں نے ماں کو یہ بھی کہا ۔۔۔ "میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔ مجھے اس طرح زنجیریں نہ ڈالو" ۔۔۔ اس نے نہایت آہستہ سے کہا ۔۔۔ "تم اُسی نامرد کے بیٹے ہو نا۔ اس نے بھی اسی طرح ضد کی تھی کہ تم مانو نہ مانو میں دوسری شادی کروں گا۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ میں تمہارا قیدی نہیں ہوں" ۔۔۔ پھر ماں رونے لگی۔۔۔

"میری زبان بند ہو گئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ ماں نے میرے باپ کے متعلق یہ کیا بات کہی ہے۔ دوسرے دن میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک رات میں کام سے واپس آیا تو ماں نے کہا کہ وہ لڑکی میرے پاس آئی تھی اور بہت بدتمیزی کر گئی

ہے۔ تم اسے ملتے رہتے ہو ـــــ میں نے کہہ دیا کہ ہاں۔ میں اسے ملتا رہتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ماں چپ تو پہلے بھی رہتی تھی مگر تین چار دنوں سے وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ کبھی ایسے نظر آتا جیسے وہ گہری سوچ میں غرق ہے۔۔۔۔

"میں نے آپ کو اپنی ماں کے متعلق اس لیے یہ باتیں سنائی ہیں کہ وہ میرے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالتی تو میں زینب کے ساتھ شادی کر لیتا۔ پھر وہ شاید قتل نہ ہوتی۔ وہ جس رات قتل ہوئی اس شام مجھے ملی تھی۔ اس نے رو رو کر کہا تھا کہ ماں کو شادی کے لیے مجبور کرو۔ میں نے اسے تسلّی دی تھی اور کہا تھا کہ میری ماں کے پاس جاتی رہا کرو اور اس کے ساتھ غصے سے نہ بولا کرو۔ اس کے دل پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔"

یہ لڑکا بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی کہانی جذباتی لحاظ سے تو سننے کے قابل تھی لیکن میری تفتیش میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھی۔ یہ لڑکا میرے لیے بالکل بیکار تھا۔ اس نے جھوٹا بیان نہیں دیا تھا۔ اس پر جرح کر کے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ اس کی کہانی ختم ہو تو اسے رخصت کروں۔ اتنے میں برآمدے میں مجھے ایک کانسٹیبل کی آواز سنائی دی۔ اس نے کسی عورت سے کہا تھا ـــــ "او مائی، اندر نہ جانا ادھر آ۔ کیا بات ہے؟" اس کے بعد ایک عورت کی آواز آئی ـــــ "مجھے کسی نے بتایا ہے کہ میرے بیٹے کو تھانے میں لے آئے ہیں۔ اسے دیکھنے آئی ہوں۔"

اکمل نے کہا ـــــ "یہ میری ماں کی آواز ہے۔ میں گھر سے باہر کھڑا تھا جب آپ کا سپاہی مجھے بلانے گیا تھا۔ میں ماں کو بتائے بغیر آ گیا تھا۔ اسے اب کسی نے بتایا ہوگا کہ مجھے پولیس لے گئی ہے۔" ـــــ مجھے اس لڑکے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلا مقصد میرا وقت ضائع کر گیا تھا۔ میں اس کے عشق و محبت کی کہانی اس لیے تحمّل سے سنتا رہا تھا کہ شاید کوئی اشارہ

تفتیش کے کام کا نکل آئے۔ میں نے اسے کہا ــــ "تم چلے جاؤ۔ ماں کو تسلی دو اور ادھر اُدھر کی باتیں سنتے رہنا۔ زینب کے قتل کے متعلق کوئی معمولی سی بات سنو تو وہ بھی مجھے بتا دینا۔"

میں نے ابھی بات پوری نہیں کی تھی کہ اس کی ماں کانسٹیبل کے روکنے کے باوجود میرے دفتر کے دروازے میں آ گئی۔ اس نے اپنے بیٹے کو میرے کمرے میں بیٹھے دیکھا، تو اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "مجھ سے کوئی سی قسم لے لو داروغہ جی! میرے بچے کا اس کٹنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ کسی کو کیا قتل کرے گا۔ اسے اتنا بڑا نہ سمجھو۔ یہ تو دودھ پیتے بچوں سے زیادہ بھولا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ یہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔" وہ اندر میرے قریب آ گئی۔ اکمل اسے روکنے کے لئے اٹھا۔ میں اسے کہنے ہی لگا تھا کہ تمہارے بیٹے کو میں نے چھوڑ دیا ہے مگر اس نے مجھے بولنے کی مہلت ہی نہ دی۔ اس نے سر سے دوپٹہ اتارا اور کرسی کے قریب فرش پر پھینک دیا اور دونوں ہاتھ میرے اس ہاتھ پر رکھ دیئے جو میز پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگی۔

میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹانے کے لیے ہاتھوں پر نگاہ کی تو میں بدک کر پیچھے ہٹ گیا ــــ اس کے ایک ہاتھ کی اُلٹی طرف پر تین اور دوسرے پر دو گہری خراشیں تھیں۔ لمبائی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ ہو گی۔ ان پر خون جما ہوا اور اوپر مرہم لگا ہوا تھا۔ اس عورت نے کرتہ پہن رکھا تھا ــــ میں نے فوراً کرتے کے بٹن دیکھے۔ اس کے تین بٹن تھے۔ نیچے والے دو پرانے اور اوپر والا نیا اور دوسروں سے مختلف تھا۔ میں نے میز کی دراز سے وہ پڑیا نکالی جس میں میں نے وہ بٹن لپیٹ رکھا تھا جو مقتولہ کی لاش کے قریب پڑا ملا تھا۔ میں نے وہ بٹن اس لئے اٹھا لیا تھا کہ جائے واردات سے ملی ہوئی ایک کنکری بھی

بعض اوقات واردات سے تمام پردے اٹھا دیا کرتی ہے۔ کوٹ، قمیض یا جرسی سے گرا ہوا بٹن ان بظاہر غیر اہم سی چیزوں میں خاص طور پر شامل ہے جو جائے واردات پر پڑی مل جایا کرتی ہیں۔ اگر تفتیش کرنے والا پولیس افسر دانش مند ہو تو ایسی غیر اہم چیزوں سے بہت کام لے سکتا ہے۔

اکمل کی ماں کے ہاتھوں پر گہری اور لمبی خراشیں اور کرتے کا اوپر کا بٹن دوسرے بٹنوں سے مختلف دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا۔ "کیا یہ عورت قتل کر سکتی ہے؟ اگر اس نے لڑکی کو قتل کیا ہی ہے تو اس کا باعث فوری اشتعال ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اشتعال کیا ہے؟"۔ اکمل اسے کندھوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹا رہا تھا اور میرا دماغ آٹا پیسنے والی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے اکمل سے کہا۔ "تم ذرا باہر جا کے بیٹھو۔ میں اسے تسلی دیتا ہوں کہ میں نے تمہیں حراست میں نہیں لیا اور نہ لوں گا۔ تم باہر چلے جاؤ۔"

اکمل باہر نکل گیا۔ میں نے اس کی ماں کو پاس پڑے ہوئے بنچ پر بٹھا دیا اور میں سوچنے لگا کہ اس عورت سے کوئی ہیر پھیر نہ کروں اور سیدھا ہی کہہ دوں کہ تم قاتل ہو۔ پھر خیال آیا کہ وہ چوکس ہو کر مجھے گمراہ کر دے گی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کتنی ہوشیار، چالاک اور حاضر جواب ہے، میں نے اس کے ساتھ اکمل کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ میں نے اس سے کئی باتیں پوچھیں۔ اس نے بالکل مختصر اور ادھورے جواب دیئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ دوسری شادی کیوں نہ کی؟"

"اس بچے کی خاطر۔" اس نے صرف اتنا سا جواب دیا۔

"یہ بچہ کتنی عمر میں اپنی بہن کے حوالے کیا تھا؟"

"ڈیڑھ پونے دو سال کا تھا۔"

"اسے بہن سے کتنی عمر میں لیا؟"

"نو سال کا ہو گیا تھا۔"

"سات آٹھ سال کہاں رہی؟"

"محنت مزدوری کرتی رہی۔"

"کہاں؟"

وہ ہکلانے لگی۔ گھبرا گئی پھر بولی۔ "فیض آباد!"

"نوکری کیا تھی؟"

"گھروں میں کام کرتی تھی۔"

"دودھ پیتے بچے کو ساتھ کیوں نہ رکھا؟"

وہ ہر سوال کا جواب فوراً نہیں دیتی تھی۔ سوچتی تھی۔ ایک لفظ کہہ کر اسے منہ میں چبا جاتی اور پھر جواب مکمل کرتی تھی اور اس کے لہجے میں رعشہ سا تھا جیسے اسے اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔ میں اس کے انداز اور لہجے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جب پوچھا کہ دودھ پیتے بچے کو ساتھ کیوں نہ رکھا؟ تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اس حالت میں وہ بالکل احمق لگ رہی تھی۔ میں نے ایک اور سوال کیا ـــ "اتنا عرصہ بچے سے ملنے کیوں نہ آئی؟ سات آٹھ سال بعد بچے کی محبت اچانک جاگ اٹھی تھی؟"

وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس کا یہ انداز ایک پولیس افسر کو مزید کریدنے پر اکساتا تھا۔ پولیس افسر کے لیے انسانی نفسیات کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ احمق نظر آنے والے لوگ ضروری نہیں کہ احمق ہی ہوں اور تیز تیز باتیں

کرنے والے اور تنز کی بہ تر کی جواب دینے والے ضروری نہیں کہ چالاک اور ہوشیار بھی ہوں۔ یہ عورت احمق ضرور تھی مگر مجھے اس سے عجیب سی بُو آرہی تھی۔ میں نے ہاتھ آگے کرکے اس کے کُرتے کے اوپر والے بٹن پر رکھا اور بٹن کھول دیا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا ہاتھ پرے ہٹا کر بٹن باندھنے لگی۔ اس کا سنہ کھل گیا تھا۔ میں جو کچھ دیکھنا چاہتا تھا وہ مجھے نظر آگیا تھا۔ بٹن دھاگے کی کمزوری کی وجہ سے نہیں گرا تھا بلکہ وہاں سے کُرتہ اتنی زور سے کھینچا گیا تھا کہ بٹن کے قریب سے کُرتہ پھٹ گیا تھا۔

اس نے بٹن بند کر لیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے یہ حرکت کی کہ چونک کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور دونوں ہاتھ دوپٹے کے اندر کر لیے۔ پولیس تمام مشتبہ افراد یا ہر قسم کے ملزم کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ نہیں کرتی۔ کم از کم میرا طریقہ تفتیش یہی تھا کہ ملزم کی نفسیاتی کمزوریوں کو سمجھ کر ان کے مطابق پوچھ گچھ کیا کرتا تھا۔ یہ عورت جس قسم کی تھی اس قسم کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جس طرح اس پر خاموشی طاری ہوگئی تھی اسی طرح میں نے اپنے اوپر خاموشی طاری کر لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہ بُت بن گئی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا اور اس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ وہ واقعی احمق تھی۔ اس نے بٹن کو چھپا لیا تھا اور اپنے ہاتھوں کو بھی چھپا لیا تھا۔ میرا دل مان نہیں رہا تھا کہ اس عورت نے قتل کیا ہوگا۔ کوئی وجہ میرے دماغ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اٹھنے لگی اور بولی "میں جا رہی ہوں"

"بیٹھی رہو" میں نے آگے جھک کر دبی آواز میں کہا — "اگر اپنے بیٹے کو سزائے موت سے بچانا چاہتی ہو تو قتل کا اقبال کر لو"

"میرے بیٹے کو؟ ..." اس نے خوف زدہ ہو کر سرگوشی میں کہا۔ "سزا اسے موت!
کیوں؟" وہ یکلخت بلند آواز سے بولی۔ "نہیں۔ نہیں داروغہ جی، وہ بے قصور ہے۔
اسے قتل کا کچھ علم نہیں۔"
"پھر تمہیں علم ہو گا" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "قاتل اس مکان میں ہے جس میں تم
رہتی ہو۔ قاتل تم ہو یا تمہارا بیٹا۔"
اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اس کے چہرے سے پسینہ پھوٹ آیا۔ وہ رونے لگی
اکمل کی کہانی میرے دماغ میں آ گئی ۔۔۔ میں خوش ہوا کہ اس لڑکے کو بولنے کا موقع دیا
تھا اور اس نے ساری ہی باتیں اُگل دی تھیں۔ مجھے یہ عورت نیم پاگل اور مشکوک نظر
آنے لگی۔ میں نے اسے کہا ۔۔۔ "کہہ دو کہ میں نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا۔"
اس نے بڑی آہستہ آہستہ کہا ۔۔۔ "میں کہہ دوں کہ میں نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا؟"
"ہاں۔ ہاں۔" میں نے کہا ۔۔۔ "کہہ دو کہ میں نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا اور لڑکی نے
اپنی گردن چھڑانے کے لیے میرے ہاتھوں پر ناخن نہیں مارے اور میرا بٹن نہیں توڑا تھا۔"
اس کا رنگ سفید ہونے لگا اور اس کا منہ اور زیادہ کھل گیا۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اقرار
کر لو یا انکار کر دو۔"
"انکار کر دوں؟" اس کے کھلے ہوئے منہ سے آواز آئی۔
"ہاں۔ ہاں۔" میں نے بڑے پیار سے کہا۔ "انکار کر دو۔"
"پھر آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟"
"چھوڑ دوں گا۔" اب تو میں اس کی نفسیات کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کوئی شک رہا ہی
نہیں تھا۔ وہ اس مرحلے میں آ چکی تھی جہاں پیشہ ور قاتل بھی سوچنے سے عاری ہو جاتے

ہیں۔ قتل ایک ایسا جرم ہے جس میں اپنی جان خطرے میں ہوتی ہے۔ پھانسی سامنے نظر آتی ہے۔ اس خوف کے ساتھ مقتول کا خون کوئی قاتل ہضم نہیں کر سکتا۔ قاتل اگر عدالت سے بری ہو جائے تو بھی چین سے زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ عورت تو بالکل سیدھی اور احمق تھی۔ اسے میں نے کہا کہ چھوڑ دوں گا تو وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

"پھر آپ میرے بیٹے کو بھی چھوڑ دیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"دونوں کو چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں۔" اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ "پولیس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں دھوکا کھا چکی ہوں۔"

"کب؟" میں نے فوراً پوچھا۔ "کس نے دھوکا دیا تھا؟"

خون اسی عورت کا تھا

میں نے یہ سوال پوچھ کر سخت غلطی کی۔ وہ میرے سوال سے اپنے آپ میں آ گئی۔ اس کا ذہن بیدار ہو گیا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ بھولا بنا رہتا اور اس پر جو ذہنی کیفیت طاری ہو گئی تھی اسے ختم نہ ہونے دیتا۔ میں نے غلط وقت پر سوال کر کے اسے جگا دیا تھا... تفتیش میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ بعض اوقات صرف ایک لفظ یا ذرا سا ایک سوال پتھر جیسے مجرم کے منہ سے نکل کر اسے ریت کا ڈھیر بنا دیتا ہے اور کبھی تفتیش کرنے والے افسر کے منہ سے نکل جاتا ہے اور مجرم اپنا دماغ اتنا مضبوط کر لیتا ہے کہ اس پر فرد جرم بھی عائد نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایسی غلطی میں یہاں کر بیٹھا۔ عورت نے قدم جما لیے جس سے مجھے یہ علم ہو گیا کہ اس نے کسی راز پر پردہ ڈال لیا ہے۔ اس نے جب کہا — "پولیس کا کوئی بھروسہ

نہیں۔ میں دھوکا کھا چکی ہوں"۔۔۔ تو مجھے اکمل کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس عورت نے بچے کو ڈیڑھ سال کی عمر میں اپنی بہن کے حوالے کیا اور اس وقت واپس آئی جب وہ نو دس سال کا ہو چکا تھا۔ بہرحال میں نے زیادہ توجہ اس واردات کو دی جو میرے لیے بڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ اس واردات کا اقبال کر لے تو اس کے ماضی تک جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اسے گھیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ عورت بالکل ہی بدل گئی۔ اس نے تڑاخ تڑاخ جواب دینے شروع کر دیئے۔ میں سارے سوال اور اس کے جواب لکھ کر آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ مختصر یہ کہ اس عورت کے اندر کوئی ایسی طاقت بیدار ہو گئی کہ میرے جال سے صاف نکل گئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے مشتبہ سمجھنا ہی چھوڑ دیتا۔

مجھے آخر لمبے چکر پر جانا پڑا۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو بلایا۔ اس عورت اور اس کے بیٹے اکمل کو حراست میں تو نہ لیا۔ انہیں تفتیش کے لیے تھانے میں پابند کر لیا دونوں کو دوسرے کمرے میں بھیج کر اُن پر ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دی۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو اس عورت کے ماضی کی خبر لانے کے لیے بہت سی ہدایات دیں اور پھر اکمل کو بلا کر اسے کہا کہ وہ اے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ اپنی اس خالہ کے گھر جائے جس کے پاس وہ نو دس سال کی عمر تک رہا ہے۔ ایک کانسٹیبل بھی ساتھ بھیج دیا۔ یہ پارٹی فوراً روانہ ہو گئی۔

مجھے توقع تھی کہ یہ لوگ دوسرے دن شام تک واپس آجائیں گے مگر نہ آئے۔ اس دوران اس عورت نے تھانے میں ادھم بپا کیے رکھا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اس کے بیٹے کو گھر بھیج دیا ہے تو اس نے چیخنا شروع کر دیا

کرہائے، اسے روٹی کون کھلائے گا۔ وہ اکیلا گھر میں ڈرتا ہو گا۔ میں نے اس کے اس پاگل پن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے میرے ہر سوال کا جواب یہی دیا۔

"جب تک میرے بچے کو سامنے نہیں لاؤ گے کوئی بات نہیں کروں گی۔"

اس دوران اسے اپنی ایک چٹھی کے ساتھ سرکاری ہسپتال بھیج دیا۔ میں نے ڈاکٹر کو پوسٹ مارٹم کا حوالہ دے کر لکھا کہ اس عورت کا خون مقتولہ کے خون کی رپورٹ کے مطابق ٹیسٹ کیا جائے۔ سرکاری ہسپتال سے رپورٹ آئی کہ یہ اسی گروپ کا خون ہے جو مقتولہ کی انگلیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

اسے ہم نے وہ دن، رات، اگلا دن اور اگلی رات بڑی مشکل سے سنبھالا۔ اے ایس۔ آئی شام سے ذرا پہلے واپس آ گیا۔ اتنا زیادہ وقت لگانے کی وجہ یہ تھی کہ اسے دو جگہوں پر جانا پڑ گیا تھا۔ وہ ایسی خبر لایا جس نے میرا دماغ روشن کر دیا۔ میں نے اکمل کو ماں سے الگ رکھا اور اپنے سٹاف سے کہا کہ اس کی ماں کو پتہ نہ چلنے دیا جائے کہ اس کا بیٹا آ گیا ہے۔ میں نے اس عورت کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"تم اپنی ضد پر قائم ہو کہ جب تک بیٹا میرے سامنے نہیں کرو گے، میں بات نہیں کروں گی۔" میں نے اسے جواب دیا۔ "اب میری سنو سن لو۔ یہاں تھانے میں پڑی چیختی رہو۔ جب تک بات نہیں کرو گی اپنے بیٹے کی صورت بھی نہیں دیکھ سکو گی۔"

"لیکن آپ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کو میں نے قتل کیا ہے۔" اس نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ "میں غریب عورت بھلا کیسے قتل کر سکتی ہوں؟"

"بالکل ایسے جیسے تم نے اپنے خاوند کو قتل کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں دوسرے

قتل کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ دونوں کو تم نے گلا دبا کر مارا۔"

وہ سمجھ کے رہ گئی۔ اس نے مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میرے ذہن میں اس کا یہ فقرہ آ گیا۔ "پولیس والوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں پہلے بھی دھوکا کھا چکی ہوں"۔۔۔ میں خود تھانیدار تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے اس کے مطابق کہا۔۔۔ "تمہیں تھانیدار نے کہا تھا کہ اقبال جرم کر لو، میں تمہیں بری کرا لوں گا مگر اس نے تمہیں آٹھ سال سزائے قید دلا دی۔"

"ہاں" اس نے اس طرح کہا جیسے سسکی لی ہو۔ "آٹھ سال۔ میں نے اس کے وعدے پر قتل کا اقرار کر لیا اور اس نے مجھے عمر قید دلانے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ یہ تو میرا وکیل تیز تھا جس نے مجھے بچا لیا اور آٹھ سال قید ہوئی۔ میں سات سال پورے کر کے جیل خانے سے نکلی۔"

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ میں اب اسے اس کیفیت سے نکالنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "ایسے خاوند کی سزا یہی تھی کہ اسے قتل کر دیا جاتا۔ افسوس یہ ہے کہ وہ تھانیدار ہندو تھا۔ میں ہوتا تو تمہیں صاف بچا لیتا"۔۔۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی ہمدردی میں چابکدستی سے باتیں شروع کر دیں اور اس کے چہرے کا آثار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ میری اداکاری کامیاب تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظروں کو سمجھ گیا۔ اس کی نظروں میں مجھے اقبال جرم صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔۔۔ "ڈاکٹر نے میری انگلی سے خون کیوں نکالا تھا؟"۔۔۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر نے تمہارا خون اس خون سے ملایا ہے جو مقتولہ کی انگلیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟"

"اس نے لکھا ہے کہ وہ خون بھی تمہارا تھا" — میں نے کہا — "اس کی انگلیوں کے ساتھ تمہارے ان ہاتھوں کا خون تھا۔ تم نے اس کا گلا دبایا تو اس نے تمہارا گریبان پکڑا۔ تمہارے کرتے کا ایک بٹن ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے تمہارے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑانے کے لیے ناخنوں سے تمہارے ہاتھ چھیل دیئے اور تمہارا خون اس کی انگلیوں کے ساتھ لگا رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے یہ خون محفوظ کر لیا تھا۔ اب تمہارا خون ڈاکٹر نے نکال کر اس کے ساتھ رکھ لیا ہے۔"

یہ ناتجربہ کار لڑکی تھی

وہ ایسی حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے میں جادوگر ہوں۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے رنجیدہ اور ہاری ہوئی آواز میں اقبال جرم کی ابتدا اس جملے سے کی — "ایک لڑکی نے مجھ سے میرا خاوند چھین لیا تھا۔ میں نے خاوند کو زندہ نہ چھوڑا کیونکہ میں جانتی تھی کہ خاوند مجھے واپس نہیں ملے گا۔ اب ایک لڑکی مجھ سے میرا بیٹا چھیننے آئی تو میں نے اس لڑکی کو زندہ نہ چھوڑا۔"

میں نے اے، ایس، آئی کو اکمل کے ساتھ اکمل کی خالہ اور خالو سے اس کی ماں کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان لوگوں نے پولیس سے کچھ چھپانے کی جرأت نہ کی اور بتا دیا کہ اس نے آگرہ میں اپنے خاوند کو قتل کر دیا تھا اور اسے آٹھ سال قید ہوئی تھی۔ اس وقت اکمل ڈیڑھ سال کا تھا۔ بچے کو اس کی خالہ لے آئی تھی۔ وہاں سے میرا اے، ایس، آئی آگرہ چلا گیا۔ کیس بہت ہی پرانا تھا۔ تاہم اے، ایس، آئی نے ہمت کی اور

تھوڑے سے وقت میں کیس نکلوا کر دیکھ آیا۔ اس عورت کا وکیل ہوشیار معلوم ہوتا تھا، جس نے نوری اشتعال ثابت کر لیا تھا جس کی بنا پر اسے آٹھ سال قید ملی ورنہ عمر قید ملتی۔ یہ تو استغاثہ اور صفائی کا کیس تھا۔ اصل کہانی اس عورت نے سنائی جو میں اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ اس عورت کا اقبالی بیان بہت ہی لمبا تھا۔

مختصر یہ کہ یہ عورت بیس اکیس سال کی عمر میں ایک ایسے آدمی کے ساتھ گھر سے چلی گئی جو عمر میں اس سے آٹھ نو سال بڑا تھا۔ یہ درمیانہ درجے کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے بیان سے میں نے اس آدمی کے متعلق رائے قائم کی کہ وہ عورتوں کا شکاری تھا اور لڑکیوں کو پھانسنے کا فن جانتا تھا۔ اس کا معمولی سا کوئی کاروبار تھا۔ والدین سے آزاد رہتا تھا۔ اکمل کی ماں کے خدوخال بتاتے تھے کہ جوانی میں خوبصورت تھی۔ اس کی خوبصورتی کے آثار ابھی تک باقی تھے۔ وہ اس آدمی کو دل وجان سے چاہتی تھی۔ اسے روپے پیسے کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس آدمی نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ وہ بھی اسے بہت چاہتا تھا۔

ڈیڑھ سال بعد اکمل پیدا ہوا۔ اس کی عمر ایک سال ہوئی تو اکمل کا باپ اس کی ماں سے نظریں پھیرنے لگا۔ اس نے ایک اور لڑکی کے ساتھ راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی تھی۔ راتوں کو دیر سے گھر آنے لگا۔ اس کا برتاؤ بہت تیزی سے بگڑتا گیا۔ اکمل کی ماں نے گلے شکوے شروع کر دیئے جس کی خاوند نے کوئی پروا نہ کی۔ پھر وہ اسے ڈانٹنے لگا۔ گھر میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ اس عورت کا اپنا تو کوئی تھا نہیں۔ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ اس نے پڑوسنوں کے ساتھ اپنے خاوند کے رویّے کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ یہ شخص شادی کا تو قائل ہی نہیں تھا۔ لوگ حیران تھے کہ اس نے اس عورت کے ساتھ شادی کیوں کر لی؟ اسے بتایا گیا کہ وہ تو بے نکاح

بیویاں رکھنے کا عادی ہے اور کوئی نہ ملے تو کسی طوائف کو گھر لے آتا ہے۔ پڑوسیوں نے اس سے پہلے اکمل کی ماں کو اس لیے یہ باتیں نہیں بتائی تھیں، کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص شادی کرکے بدکاریوں کو ترک کر چکا ہے مگر وہ پھر اپنی ڈگر پر آ گیا تو پڑوسیوں نے اکمل کی ماں کو بتا دیا کہ اس کا خاوند بدقماش ہے۔

اس کے خاوند نے اکمل کی ماں کو یہ طعنے دینے شروع کر دیئے کہ وہ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اس لیے وہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں۔ ایک روز وہ ایک لڑکی کو گھر لے آیا اور دونوں بند کمرے میں بیٹھے رہے۔ لڑکی کے جانے کے بعد اکمل کی ماں نے احتجاج کیا تو خاوند نے اسے کہا کہ تم میری غیر حاضری میں عیش کرتی ہو اور میں تمہارے سامنے عیش کر رہا ہوں۔ اس نے بیوی پر صاف الفاظ میں بدکاری کے الزام لگانے شروع کر دیئے اور کہا کہ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ اکمل کی ماں اس کے پاؤں پڑی اور رو رو کر کہا کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے۔ خاوند نے اسے کہا ——" میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔ دوسری شادی ضرور کروں گا" —— گھر میں شدید تاچاقی پیدا ہو گئی۔

اس لڑکی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ جا کر سر چھپاتی۔ ماں باپ کے گھر جا نہیں سکتی تھی۔ اس کے خاوند نے الگ کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا۔ ایک رات اس کا خاوند گھر آیا تو اس کے ساتھ وہی لڑکی تھی جس کے ساتھ اس نے دوستی گانٹھ لی تھی۔ خاوند شراب میں بدمست تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑا۔ نشے میں اس نے اپنی دوست کو آواز دی۔ وہ قریب گئی تو خاوند نے اس لڑکی کو بازو سے پکڑ کر پلنگ پر گرا لیا۔ اکمل کی ماں اس کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ یہ منظر وہ برداشت نہ کر سکی۔ دماغ تو اس کا پہلے ہی چل گیا تھا۔ اب بالکل ہی پاگل ہو گئی۔

وہ چیل کی طرح خاوند کی طرف جھپٹی۔ لڑکی تیزی سے اٹھ کر باہر کو دوڑی۔ اکمل
کی ماں نے خاوند کی گردن ہاتھوں میں دبا لی اور اسے چھوڑا اُس وقت جب وہ مر چکا
تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ خاوند مر گیا ہے تو صحن میں جا کر وہ بَین کرنے اور اپنے منہ اور
سینے پر ہاتھ مار مار کر رونے لگی۔ محلے دار آ گئے۔ اس نے سب کو بتا دیا کہ اس نے اپنے
خاوند کو مار دیا ہے۔ محلے میں کچھ اچھے لوگ تھے۔ وہ اسے بھی جانتے تھے اور اس کے
خاوند کو بھی۔ انہوں نے اسے کہا کہ وہ پولیس کے سامنے یہ نہ کہے کہ اپنے خاوند کو اس نے
خود مارا ہے۔ وہ ان کی بات سمجھ گئی اور جب پولیس آئی تو اس نے یہی بیان دیا کہ وہ اپنے
خاوند کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ شراب کے نشے بدمست تھا اور ایک لڑکی اس کا گلا
گھونٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر لڑکی بھاگ گئی لیکن خاوند مر چکا تھا۔ لڑکی کا اتا پتا کسی
کو بھی معلوم نہ تھا۔ محلے داروں نے بیان دیا کہ گلی میں انہوں نے کسی کے دوڑنے کی
آواز سنی تھی اور مقتول کی بیوی شور مچا رہی تھی کہ میرے خاوند کو یہ چڑیل مار گئی ہے
یہ ناتجربہ کار لڑکی تھی، اس نے اپنی صفائی میں ایسا بیان دیا جو ثابت کرنا ممکن نہیں تھا
وہ پولیس کو گمراہ نہ کر سکی۔ تھانیدار ہندو تھا۔ اس نے اسے چکنی چپڑی باتوں سے یہ جھانسہ
دے کر کہ وہ اسے بری کرا دے گا، اقبال جرم کرا لیا۔ اس کا وکیل عقل مند تھا جس نے محلے
داروں کی گواہی سے اشتعال ثابت کر دیا اور وہ عمر قید سے بچ گئی۔ اس کے ماں باپ
اور دو بھائیوں نے اس کی پرواہ ہی نہ کی۔ اس کی ایک ہی بہن تھی جو انبالہ میں خاوند کے
ساتھ رہتی تھی۔ خاوند کو ساتھ لا کر مدد کے لیے پہنچ گئی۔ اکمل کے باپ کے رشتہ داروں نے اس
کے مکان اور سامان پر قبضہ کر لیا تھا۔

اکمل کی خالہ اکمل کو اپنے پاس لے گئی۔ وکیل اسی نے کیا تھا۔ اکمل کی ماں کو آٹھ

سزا ملی - ایک سال معافی مل گئی جو جیلوں میں قاعدے کے مطابق ملا کرتی ہے۔ قید پوری کر کے وہ اپنی بہن کے پاس گئی اور اس نے اپنا پیار اور زندگی اکمل کے لیے وقف کردی۔ اس کی بہن امیر نہیں تھی اور نہ ہی وہ غریب تھی لیکن اکمل کی ماں نے اس پر بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جھاڑو برتن کرتی رہی اور اکمل کو پالتی اور پڑھاتی رہی۔ اکمل کے ساتھ اس نے جس طرح پیار کیا وہ آپ اکمل کی زبان سے سن چکے ہیں۔ اب اس کی ماں کی زبانی سنیے۔

یہ ممتا کی ایک غیر معمولی کہانی ہے۔ ماں کا پیار بعض حالات میں پاگل پن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ماں کا ایسا شدید پیار بچے کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ اکمل کی ماں کے حالات آپ نے سن لیے ہیں۔ اس نے محبت کی خاطر ماں باپ کا گھر چھوڑا اور ایک گھر بسایا جہاں اس کے لیے خوشحالی اور پیار تھا مگر سب کچھ لٹ گیا۔ اس کے پاس صرف پیار کی دولت رہ گئی جو اس نے اپنے بچے کے لیے وقف کردی۔ لیکن یہ ڈر اس کے دل میں گھر کر گیا کہ کوئی اس سے اس کے بچے کو بھی چھین کے لے جائے گا۔

"وہ جب جوان ہو گیا تو بھی میں رات کو دو تین بار اٹھ کر اسے دیکھتی تھی اور کتنی ہی دیر اس کے سرہانے کھڑی رہتی تھی" ___ اس نے کہا ___ "وہ سولہ سترہ سال کا ہو گیا تو بھی میں اسے اپنے پاس سلاتی تھی۔ ایک روز اس نے کہا کہ میں الگ سویا کروں گا۔ خدا جانتا ہے کہ میرے دل کا کیا حال ہوا۔ میں بہت دیر سوچتی رہی کہ میرا بیٹا مجھ سے الگ کیوں سونا چاہتا ہے؟ کیا میں اسے اچھی نہیں لگتی؟ یا شاید اپنے آپ کو جوان سمجھنے لگا ہے۔ یہ تو مجھے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ وہ جوان ہو گیا ہے لیکن وہ جب پہلی بار دوسری چارپائی پر سویا تو رات میری آنکھ بار بار کھلی۔ مجھ پر یہ وہم سوار ہو گیا کہ مجھ سے کوئی میرا بچہ چھین کے لے گیا ہے۔۔۔

مقتولہ اس کا بیٹا چھیننے آئی تھی

"اب وہ رات بارہ بجے واپس آتا ہے اور میں اس وقت تک جاگتی رہتی ہوں۔ داروغہ جی، آپ کے بھی بچے ہوں گے۔ آپ ان سے پیار کرتے ہی ہوں گے لیکن میرے پیار کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ آپ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ جس روز یہ لڑکی جو قتل ہو گئی ہے، میرے گھر میں آئی اور اکمل اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا تو میرے اندر کیسی آگ لگی تھی۔ فوراً میرے سامنے وہ لڑکی آ گئی جس نے میری دنیا ہی تباہ کر ڈالی تھی اور میرے ہاتھوں میرا سہاگ اور میرا پیار قتل کرا دیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میرا دل سمجھ جائے کہ میرا اکمل جوان ہو گیا ہے اور اب اس کے لیے ایک جوان لڑکی کی ضرورت ہے۔ ایک لڑکی کو اب میرے گھر آنا ہی ہے مگر اکمل مجھے اپنے باپ کی طرح نظر آتا رہا اور یہ لڑکی بالکل اسی لڑکی کی شکل اختیار کر گئی جس نے مجھے اس حد تک پہنچا دیا تھا۔ میرا دل نہ مانا اور دل یہی کہتا رہا کہ یہ بھی ایک ڈاکو ہے اور تیرا بیٹا تیرے ہاتھ سے نکل رہا ہے......

"میں نے اکمل کو ڈانٹ دیا۔ پھر لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔ اکمل نے مجھے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ لڑکی بڑی اچھی ہے اور وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر میرے دل میں یہی خوف طاری رہا کہ نہیں یہ لڑکی تجھ سے تیرا بیٹا چھیننے آئی ہے۔ لڑکی کی ماں بھی میرے گھر میں آئی مگر میرے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ اکمل میرے ساتھ بگڑنے لگا اور ایک روز اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ ماں، میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔ میں جوان ہوں، کماتا ہوں، تمہاری خدمت کرتا ہوں۔ میں ساری عمر صرف تمہارا قیدی نہیں رہ سکتا۔ وہ باہر نکل گیا اور میں کچھ سمجھنے کی بجائے پاگل ہوتی رہی۔ ایک روز یہ لڑکی پھر میرے گھر آ گئی۔ پہلے

تو اس نے میرے ساتھ پیار کی باتیں کیں۔ میں اکمل کے رویے سے جلی بیٹھی تھی۔ وہ میرے ساتھ اس طرح بیگانوں کی طرح کبھی نہیں بولا تھا۔ اسی لڑکی کی وجہ سے میرا بیٹا مجھ سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ میں نے لڑکی کو دھتکار دیا اور یہ بھی کہا کہ چڑیل کوئی اور گھر دیکھ۔ تجھ جیسی ایک چڑیل میرا گھر اجاڑ چکی ہے۔ وہ بھی غصے میں آ گئی۔ اس نے مجھے کہا کہ اپنے بیٹے کا دل توڑ کر تُو پچھتائے گی۔ ساری عمر اسے ڈھونڈتی پھرے گی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ میں دیکھ لوں گی کہ تُو اپنے بیٹے کے ساتھ کس طرح رہے گی؟....

"میں نے اکمل کو یہ بات نہیں بتائی۔ وہ گھر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ اکمل، تُو اس لڑکی سے ملتا ملاتا رہتا ہے؟ اس نے بے رُخی سے جواب دیا۔ 'ہاں ملتا ملاتا رہتا ہوں'۔ میں نے اسے کہا کہ بیٹا، اپنی پاگل ماں کا تجھے کوئی خیال نہیں؟ اس نے جواب دیا۔ 'اپنے ساتھ مجھے بھی پاگل نہ کر ماں، میں اسے ملتا ہوں اور ملتا رہوں گا۔ تُو مجھے کب تک زنجیریں ڈالے رکھے گی۔ سینما جاؤں تو تیری اجازت لوں، کوئی کپڑا بناؤں تو تیری اجازت لوں۔ ذرا باہر نکلوں تو تیری اجازت لوں'۔ — ماں کا دل چلتی میں پستا رہا داروغہ جی، اور وہ شام آئی کہ میں نے اپنے دل سے کہا، تیرا بیٹا بھی ہاتھ سے گیا۔ اُس شام وہ بہت بگڑ کر گیا۔ اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اپنے بیٹے کے سوا میں کسی دوسرے کو نہیں جانتی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے پڑوس کے لوگ کیسے ہیں۔ اس لڑکی کے متعلق میں اتنا ہی جانتی تھی کہ مجھ سے میرا بیٹا چھیننے آئی تھی۔ اس

شام میرا بیٹا کھانا کھائے بغیر نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گھر سے نکلی۔ میں اسے روکنا نہیں چاہتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ وہ اور زیادہ بگڑے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اس کے پیچھے آ رہی ہوں۔ اندھیرا تھا میں نے دیکھا کہ وہ سڑک کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف جا رہا تھا جہاں کھلا اور ویران علاقہ ہے۔ میں ادھر ہی چلی گئی۔ غیر آباد علاقے میں مجھے ایک اور سایہ نظر آیا۔ اکمل اس کے پاس رک گیا اور دونوں ایک طرف ہو گئے جہاں دو درخت ہیں۔ میں بیٹھ گئی۔ مجھے ان کی باتیں سنائی دے رہی تھیں لیکن کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ میں جان گئی کہ یہ وہی لڑکی ہے اور میرا بیٹا اسی سے ملنے ادھر آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے بیٹے کو جاتے دیکھا اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ لڑکی وہیں کھڑی رہی۔ آسمان گھوم رہا تھا۔ زمین کانپ رہی تھی۔ میں آگے کو چل پڑی۔ لڑکی نے میرے پاؤں کی آہٹ سنی تو وہاں سے چل پڑی۔ میں بہت تیز چل رہی تھی۔ فوراً اس تک پہنچ گئی اور اسے کہا، ٹھہر جا ذرا . . . .

"وہ رک گئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور بولی۔ اری تُو اپنے بیٹے کی جاسوسی بھی کرتی ہے؟ میں نے اس طرح دونوں ہاتھوں میں اس کی گردن دبوچ لی جس طرح پھندا بند ہوتا ہے۔ اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے جھٹکا دیا تو کرتے کا اوپر کا بٹن ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے ناخن میرے ہاتھوں میں گاڑ کر میری کھال ادھیڑ لی مگر میں نے اس کی جان لے کر دم لیا۔ اُس وقت جب اس کی گردن میرے ہاتھوں میں تھی، مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ اس لڑکی کی گردن ہے جسے میرا خاوند گھر لایا تھا۔"

میں نے اس کا بیان ایک مجسٹریٹ سے ریکارڈ کروا لیا۔ یہ عورت میری زندگی کا ایک اور غیر معمولی اور ناقابلِ فراموش کردار ہے۔ مجھے اس کے ساتھ دلی ہمدردی تھی لیکن میں اس کی

کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے استغاثہ مضبوط کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں اس عورت کی یہ مدد کر سکتا تھا کہ اس کی پہلی سزا پر پردہ ڈال دیتا لیکن میرا اے، ایس، آئی ہندو تھا۔ وہ ریکارڈ دیکھ آیا تھا۔ اسے چھپانا ممکن نہیں تھا۔ کیس کورٹ میں گیا۔ سیشن سپرد بھی ہو گیا جہاں ملزمہ اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو گئی۔ اقبالی بیان ٹھوس شہادت کے بغیر محض بیکار ہوتا ہے۔ سیشن جج نے اس کے پہلے قتل کا حوالہ دے کر اسے عمر قید کی سزا دی لیکن ہائی کورٹ نے اس کی اپیل منظور کرتے ہوئے اسے بری کر دیا۔ اسے شک کا فائدہ دیا گیا تھا۔

اکمل نے وکیل اچھا کیا تھا۔ اس نے دو نقطوں پر زیادہ زور دیا تھا۔ ایک یہ کہ موقعہ کا گواہ کوئی نہیں تھا۔ دوسرا نقطہ یہ تھا کہ خون کے گروپ مل جانا کوئی شہادت نہیں۔ دس آدمی اکٹھے کرو تو ان میں سے پانچ کا گروپ ایک ہو گا۔ وکیل نے یہ نقطہ بھی پکڑا کہ اس عورت کے لیے قتل کی نہ کوئی وجہ تھی نہ کوئی فوری اشتعال۔ اگر اس نے بیس سال پہلے اپنے خاوند کو قتل کیا تھا تو یہ کیسے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس لڑکی کو بھی اسی عورت نے قتل کیا ہے؟

میں نے استغاثہ میں مقتولہ کی ماں سے عدالت میں یہ بیان دلوایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اکمل کو دینا چاہتی تھی لیکن ملزمہ کو پسند نہیں تھا۔ اکمل نے اپنی ماں کی صفائی میں یہ بیان دیا کہ اس نے جب اپنی ماں سے ذکر کیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو ماں بہت خوش ہوئی اور اس نے کہا تھا کہ اسے یہ لڑکی بہت پسند ہے۔ وہ لڑکی کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ لڑکی قتل ہو گئی۔

بیٹے نے ماں کو عمر قید سے صاف بچا لیا۔

کون کس کا قاتل

بوڑھا خاوند، جوان بیوی، جوان بیٹا
یہ ہے قتل کا ایک تیر بہدف نسخہ

ایک لڑکی، عمر بیس اکیس سال اپنے خاوند کے ساتھ تھانے میں آئی۔ اس کا نام رفعت تھا اور خاوند کا نام مرتضےٰ۔ ان کی شادی ایک سال گزرا ہوئی تھی۔ وہ اپنے سسرال میں تھی۔ اسے اطلاع ملی کہ اس کا باپ مر گیا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا باپ بیمار نہیں تھا۔ آج صبح وہ بستر پر مرا ہوا پایا گیا۔ اس آدمی کی عمر اڑتالیس سال تھی ایک سال گزرا اس نے راحت نام کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی جس کی عمر بائیس سال تھی۔ متوفی کی بیٹی رفعت نے بیان دیا کہ اس کی ماں دو سال ہوئے مر گئی ہے۔ ایک سال بعد اس کے باپ نے راحت سے شادی کر لی تھی۔ رفعت کا ایک بھائی جوان تھا۔ عمر تئیس سال۔ اس سے چھوٹی رفعت تھی اور اس سے چھوٹا ایک اور بھائی جس کی عمر سولہ سال تھی۔ رفعت کو باپ کے مرنے کی اطلاع ملی تو وہ بھاگی ہوئی پہنچی۔ اسے اس کے بھائی عاشق علی اور سوتیلی ماں راحت نے بتایا کہ اس کا باپ حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گیا ہے۔ وہ اچھا بھلا تھا۔ رفعت کے بیان کے مطابق اس سے پہلے اسے دل کی کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ رفعت اور اس کے خاوند

مرتضیٰ کو شک ہوا کہ متوفی کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ میرے پاس اس لیے آئے تھے کہ میں مرنے والے کا پوسٹ مارٹم کراؤں۔

ایسے تو ہو نہیں سکتا کہ کسی کی محض رپورٹ یا شک پر کسی کی لاش کو چیرنے پھاڑنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ پوسٹ مارٹم کرانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس کو بھی شک ہے کہ مرنے والا قدرتی موت نہیں مرا، اسے مارا گیا ہے۔ معاملہ بہت سنگین ہو جاتا ہے۔ میں نے رفعت اور اس کے خاوند پر کم و بیش ایک گھنٹہ جرح کی جس سے مجھے صرف یہ حاصل ہوا کہ رفعت کو شک ہے کہ اس کے باپ کو اس کی سوتیلی ماں نے اس کے بھائی کے ساتھ مل کر قتل کرا دیا ہے۔ ان کے پاس اس شک کو تقویت دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی شہادت نہ کوئی ثبوت۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے بھی جرح کی کہ رفعت اور اس کا خاوند کسی عداوت کی بنا پر تو یہ رپورٹ درج کرانے نہیں آئے؟ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی نیت میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کی رپورٹ درج کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دوں، لیکن میں نے جب تین افراد پر غور کیا تو میرے دل میں بھی شک پیدا ہو گیا — متوفی کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ اس کی بیوی کی عمر بائیس سال تھی اور متوفی کے بیٹے کی عمر تیئس سال تھی۔ اگر آپ کسی بھی پولیس سٹیشن میں وارداتوں اور مقدموں کا ریکارڈ دیکھیں تو قتل کی بہت سی کہانیوں میں آپ یہ تین کردار ضرور دیکھیں گے۔ بوڑھا خاوند، جوان بیوی، مرنے والے کا جوان بیٹا — اس کیس میں جائیداد کا لالچ بھی تھا۔

"تمہارے بڑے بھائی کے تعلقات سوتیلی ماں کے ساتھ کیسے تھے؟" میں نے

رفعت سے پوچھا۔

"بہت اچھے۔" رفعت نے جواب دیا۔" ان کی بے تکلفی قابلِ اعتراض تھی۔" رفعت کا خاوند بول پڑا۔" راحت اچھے چلن کی لڑکی نہیں۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ عاشق علی (رفعت کے بڑے بھائی) کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔"

"یہ کوئی ثبوت نہیں۔" میں نے کہا۔

"ثبوت تو میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتی۔" رفعت نے کہا ـــ "میں نے اپنی سوتیلی ماں کو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مشکوک حالت میں دیکھا ہے۔" رفعت نے میرے پوچھنے پر مشکوک حالت بیان کی۔ اس کے چھوٹے بھائی کی عمر سولہ سال تھی۔ رفعت نے راحت کے ساتھ لڑائی کی تھی اور اپنے بھائی کو ڈانٹا تھا اور ابا جان کو بتا دینے کی بھی دھمکی دی تھی ـــ میرے لیے یہ باتیں قابلِ فہم تھیں۔ جہاں جوان بیٹا اور جوان سوتیلی ماں ہو وہاں کے متعلق کیسا ہی جھوٹ بول دو سچ لگتا ہے لیکن جب آپ تھانیدار کی وردی پہن لیتے ہیں تو آپ کی نظروں میں جھوٹ اور سچ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ میں نے رپورٹ درج نہ کی۔ متوفی کے گھر جا کر اور کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں جب رفعت اور مرتضیٰ کے ساتھ متوفی کے گھر پہنچا تو میت کو نہلا کر کفن پہنایا جا چکا تھا۔ قبر تیار ہو چکی تھی اور جنازہ اٹھنے والا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ پونے بارہ بجے تھے۔ باوردی تھانیدار کو دیکھ کر وہاں جو لوگ موجود تھے، سناٹے میں آ گئے۔ میں نے متوفی کے بڑے بیٹے عاشق علی کو الگ کر کے پوچھا کہ اس کے والد صاحب کس وقت فوت ہوئے ہیں؟ اس نے بتایا کہ صبح اس کی سوتیلی ماں روتی چیختی سونے کے کمرے

سے نکلی اور بتایا کہ ابا جان مر گئے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا ــــ "قدرتی بات ہے کہ تم نے لاش کے ماتھے پر یا نبض پر ہاتھ رکھا ہوگا۔ لاش گرم تھی یا سرد؟"

اس نے جواب دیا ــــ "میں نے کبھی کسی لاش کو ہاتھ نہیں لگایا اس لیے بتا نہیں سکتا کہ لاش کتنی سرد ہوتی ہے۔ ابا جان کی لاش کوئی زیادہ سرد نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ کچھ حرارت تھی۔"

میں نے اسے کہا ــــ "میں آپ کی سوتیلی ماں سے علیحدگی میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

تب وہ گھبرایا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آہستہ سے بولا ــــ "کیوں جی، کیا بات ہے؟"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا ــــ "گھبرائیں نہیں مجھے صرف یہ یقین کرنا ہے کہ آپ کے والد صاحب حرکتِ قلب بند ہونے سے فوت ہوئے ہیں۔" وہ اندر چلا گیا۔

جو لوگ جنازے کے لیے آئے ہوئے تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ میں بھی جنازے کے لیے آیا ہوں۔ عاشق اندر چلا گیا تو چند آدمی میرے قریب آ گئے۔ ایک نے کہا۔

"دیکھو صاحب، آج کی اولاد۔ باپ کا ابھی پوری طرح انتقال بھی نہیں ہوا اور جنازہ لے جایا جا رہا ہے۔"

یہ تو میں نے پہلے ہی نوٹ کر لیا تھا کہ گھر والے میت کو دفن کرنے میں جلدی کر رہے ہیں۔ عاشق علی باہر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جنازہ اتنی جلدی کیوں لے جایا جا رہا ہے؟ اس نے سوتیلی ماں کے متعلق کہا کہ اس کے اصرار پر جلدی کی جا رہی ہے۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک جوان لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے اندر جاتے ہی اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چہرے اور ڈیل ڈول کو غور سے دیکھا۔ اکثر وارداتوں میں مشتبہ افراد

کے چہرے راز فاش کر دیا کرتے ہیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر وہی تاثر تھا جو ہر اُس جوان لڑکی کے چہرے پر ہوتا ہے جس کا بوڑھا خاوند ایک ہی سال بعد مر گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تو در کنار ہلکی سی لالی بھی نہیں تھی۔ وہ اچھے قد کاٹھ کی لڑکی تھی چہرہ بھی اچھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی گھبراہٹ قدرتی بات تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ عاشق علی کو میں نے باہر بھیج دیا۔

"مرحوم کس وقت فوت ہوئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ....." اس کے ہونٹ سوکھ گئے اور تین بار "آپ آپ" کہہ کر بولی۔ "آپ کے دوست تھے؟ آپ کیوں....." وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"جی۔ وہ میرے دوست تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ کس وقت فوت ہوئے ہیں؟"

"صبح میری آنکھ کھلی۔ انہیں جگایا تو وہ نہ بولے۔ میں نے ہلایا تو بھی نہ جاگے۔ جب دیکھا تو مجھے شک ہوا....."

میں نے اسے ٹوک کر پوچھا۔ "آپ نے انہیں ہاتھ لگایا تو جسم گرم تھا یا سرد؟"

"کچھ کچھ گرم تھا۔" اس نے جواب دیا مگر جواب بدلنے کے لیے ہکلانے لگی۔ میں نے اس کی تصحیح کو قبول نہ کیا۔ سچی بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اس کے مطابق مرنے والا ایک یا ڈیڑھ گھنٹے پہلے مرا تھا۔ یعنی پانچ اور ساڑھے پانچ بجے صبح کے درمیان۔ بہر حال رات کو مرنے کا پتہ صبح کے وقت چلا اور پونے بارہ بجے وہ جنازہ اٹھوا رہی تھی۔ میں نے جنازے میں جلدی کی وجہ پوچھی تو وہ کوئی دو ٹوک جواب نہ دے سکی جس سے میں شک میں پڑ گیا۔ میں نے پوچھا کہ مرحوم کو پہلے کبھی دل کا دورہ پڑا یا بلڈ پریشر کی زیادتی کبھی محسوس کی تھی؟ اس نے بتایا۔ "کل صبح جاگے تو کہنے

کہ دل ڈوب رہا ہے اور سر میں گرانی ہے۔ چکر بھی محسوس ہوتے ہیں"۔۔۔ میں نے پولیس کے مخصوص انداز میں جرح شروع کر دی۔ یہ جرح بہت طویل تھی جو آپ کو سنانا اس لیے مناسب نہیں سمجھتا کہ ایک تو یہ میاں بیوی کے تنہائی کے تعلقات کے متعلق تھی اور دوسرے اس لیے کہ بات لمبی ہو جائے گی اور آپ اکتا جائیں گے۔ میں معلوم یہ کرنا چاہتا تھا کہ متوفی کا دل ڈوب رہا تھا اور سر میں گرانی تھی تو کیا وہ کسی ڈاکٹر کے پاس گیا تھا؟ راحت نے مجھے گمراہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے یہ احساس نہیں تھا کہ میں پولیس مین ہوں اور سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ میں نے یہ اخذ کیا کہ متوفی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن بیوی اسے آرام کا مشورہ دے رہی تھی اور اسے لٹا کر اس کا سر دبا رہی تھی۔

میں نے آخری بم پھینکا۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "مرحوم کی عمر اڑتالیس سال اور آپ کی عمر اکیس بائیس سال ہے۔ یہ شادی یقیناً آپ کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ آپ پر زبردستی کی گئی ہو گی اور آپ کو بہت افسوس ہوا ہو گا"۔

اس نے مجھے نہیں روک لیا اور خوشی کے لہجے میں بولی۔۔۔ "جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں تو بہت خوش تھی"۔۔۔ اس نے منہ بسور لیا اور کہنے لگی۔۔۔ "اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ میری تو زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ وہ تو اتنے اچھے تھے کہ میں بتا نہیں سکتی"۔

لڑکی ایکٹنگ کر سکتی تھی۔ میں یہی جواب سننا چاہتا تھا۔ میں نے عاشق علی کو بلایا اور کہا۔۔۔ "میں آپ کو بڑے افسوس سے اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کے والد صاحب کی میت قبرستان میں نہیں جائے گی۔ ہسپتال پوسٹ مارٹم کے لیے جائے گی"۔

میں نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ عاشق علی نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیوں جی؟" اور راحت کا رنگ نمایاں طور پر پیلا پڑ گیا۔ وہ تو بے ہوش ہونے والی تھی۔ اس کے ہونٹ

خشک ہو گئے اور کانپنے بھی۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔آئی اور دو کانسٹیبلوں کو بلایا۔ متوفی کی بیٹی رفعت کے نام سے رپورٹ درج کی اور جو کاغذی ابتدائی کاروائی ضروری تھی وہ کی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی۔ اس دوران عاشق علی اور راحت نے مجھے الگ جاکر اس مقصد کے لیے رشوت پیش کی کہ میں لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کراؤں۔ وہ کہتے تھے کہ مرحوم کی بے عزتی ہو گی۔ بات کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ دل کی حرکت بند ہونے سے مرے ہیں۔ رشوت نے میرے شکوک پختہ کر دیئے۔ میں نے عاشق علی اور راحت سے کہا کہ وہ گھر میں ہر وقت حاضر رہیں اور انہوں نے تفتیش سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ جرم تصور ہو گا۔ عاشق علی کو جب یہ پتہ چلا کہ اس کی بہن نے رپورٹ درج کرائی ہے تو اس نے کہا۔

"یہ جائیداد کا چکر ہے۔ جب سے اس کی شادی کی ہے وہ اپنا حصہ مانگ رہی ہے۔ اس کا خاوند اسے اکسا رہا ہے۔ اب وہ پریشان کرنا چاہتی ہے تاکہ اسے حصہ مل جائے۔"

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ تمام جائیداد ابھی باپ کے نام ہے۔

وہ اچھے چلن کی لڑکی نہیں تھی

متوفی کا کاروبار بھی تھا اور زمیندارہ بھی۔ قصبے میں اس کی چار دکانیں کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ عاشق علی دس جماعت پاس کر کے باپ کے کاروبار میں لگ گیا تھا۔ یہ گھرانہ روپے پیسے والا تھا، لیکن تعلیم واجبی تھی۔ چونکہ گھر میں دانے تھے اس لیے یہ لوگ اپنے آپ کو سیانے بھی سمجھتے تھے اور کوئی غلط حرکت کرنا چاہیں تو دلیری سے گزرتے تھے۔ میں نے مخبروں کو ہدایات دے کر مصروف کر دیا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر

پہلے لاش عاشق علی کے حوالے کر دی گئی اور مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی۔ متوفی کو زہر دے کر مارا گیا تھا۔ یہ کوئی عام قسم کا زہر نہیں تھا۔ مقتول کے معدے کے اجزا، جگر اور خون لیبارٹری معائنے کے لیے بھیجے گئے تو رپورٹ ملی کہ مقتول کو نکوٹین دی گئی ہے۔ نکوٹین کے متعلق آپ کو کچھ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ زہر تمباکو کے پتوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔
... ہم جو تمباکو سگریٹ اور حقے کے ذریعے پیتے ہیں، اس میں بھی نکوٹین موجود ہوتی ہے جو تمباکو نوش دھوئیں کے ذریعے اپنے خون میں شامل کرتے اور اپنی عمر کم کرتے رہتے ہیں۔ اگر نکوٹین ذرا زیادہ مقدار میں چلی جائے، کھانے، یا مشروب میں ملا کر کسی کو پلا دی جائے تو پینے والے کے خون میں شامل ہو کر اسے چند دنوں میں اس طرح مار دیتی ہے کہ موت قتل نہیں لگتی بلکہ حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے۔ اگر بہت زیادہ مقدار میں پیٹ میں چلی جائے تو فوری موت کا باعث بنتی ہے۔ میں آپ کو خبردار کرنے کے لیے دو باتیں بتا دوں۔ ایک یہ کہ آپ سگریٹ یا حقہ پیتے ہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے جسم کی تہائی ہم قوتیں بیکار کر کے اپنے آپ کو قتل کر رہے ہیں اور دوسری بات یہ نوٹ کر لیں کہ کسی کو قتل کرنے کے لیے اگر آپ نکوٹین استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے پکڑے جانے کے امکانات پوری طرح روشن ہیں۔

میں نے جب نکوٹین کا نام پڑھا تو مجھے مقتول کی بیوہ راحت کی وہ بات یاد آئی جو اس نے کہی تھی — "کل صبح جاگے تو کہنے لگے کہ دل ڈوب رہا ہے اور سر میں گرانی ہے۔ چکر بھی محسوس ہوتے ہیں" — میں نے جرح کر کے یہ بھی ثابت کر لیا تھا کہ راحت نے مقتول کو ڈاکٹر کے پاس نہیں جانے دیا تھا اور اسے لٹا کر اس کا سر دبا تی رہی تھی۔ یاد رکھیے کہ مقتول کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ یہ عین قدرتی ہے کہ نوجوان بیوی جب اسے لٹا کر

اس کا سر دبا رہی ہو گی تو وہ اپنے حشر سے بے خبر مدہوش ہو گیا ہو گا۔ بڑھاپے میں نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بوڑھا زن مرید ہو جاتا ہے۔ یہ مقتول بھی بیوی کے حسین جال میں پھنس گیا اور جان دے دی مگر مجھے شہادت کی ضرورت تھی۔ یہ تو میری قیاس آرائیاں تھیں جو غلط بھی ہو سکتی تھیں۔ مقتول کو زہر ضرور دیا گیا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی اور نے دیا ہو۔ اگر بیوی نے ہی دیا ہے تو کسی چاہنے والے کے ساتھ مل کر دیا ہو گا۔ بہر حال میں ابھی اسے حراست میں نہیں لے سکتا تھا نہ لینا چاہتا تھا۔ اسے اور عاشق علی کو شاملِ تفتیش کر کے پابند کر لیا۔

میں نے سب سے پہلے عاشق علی کی بہن رفعت کے بیان لیے۔ اس سے پوچھا کہ اسے کیسے شک ہوا تھا کہ اس کا باپ قدرتی موت نہیں مرا۔ یہ لڑکی خاصی ذہین تھی۔ جسمانی لحاظ سے بھی چست تھی اور دماغی لحاظ سے بھی تیز۔ میرے اس سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ یہ محض شک تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عاشق علی اور راحت کی آپس میں بہت بے تکلفی تھی۔ راحت کے متعلق اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں۔ اس نے اسے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔ میں نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ کیا اسے اپنے بھائی پر شک ہے کہ اس نے راحت کے ساتھ مل کر اپنے باپ کو زہر دیا ہے؟

رفعت نے کہا۔ ”شک نہیں، مجھے تو یقین ہے کہ ابا جان کو زہر دینے میں عاشق علی بھی شریک ہے۔“

وہ کوئی قابلِ اعتماد ثبوت پیش نہ کر سکی۔ اس کی باتیں کچی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ اس نے زہر کے شک کا اظہار کیا اور یہ صحیح نکلا۔ حالانکہ لاش کو دیکھ کر مجھ جیسے

تجربہ کار آدمی کو بھی شک نہیں ہوا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ اکثر اوقات عام قسم کے تیز زہر دے کر قتل کی وارداتیں کی جاتی ہیں۔ یہ زہر دو سے چار گھنٹوں میں لاش پر اپنے اثرات نمایاں کر دیتے ہیں۔ بعض لاشوں کا رنگ نیلا ہو جاتا ہے۔ بعض کی جلد پھٹنے لگتی ہے اور بعض لاشوں کے منہ سے جھاگ پھوٹنے لگتی ہے۔ غرض زہر کی ماری ہوئی لاش صاف بتا دیتی ہے کہ موت قدرتی نہیں، یہ قتل ہے۔ رفعت کے باپ پر ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ پھر رفعت کو زہر کا شک کیوں ہوا؟ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ جو بہن اپنے بھائی کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر سکتی ہے وہ اپنے باپ کو زہر بھی دے سکتی ہے اور یہ جائیداد کی خاطر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا کہ مقتول کی نوجوان بیوہ، راحت نے مقتول کو دفن کرنے میں جلدی کیوں کی؟ رفعت کے متعلق میں نے کہا ہے کہ جسمانی اور دماغی لحاظ سے تیز تھی۔ وہ مجھے چالاک بھی نظر آنے لگی۔

اس کا خاوند باہر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے رفعت کو باہر بھیج کر اسے بلا لیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اس سے میں نے پہلا سوال یہ پوچھا۔

"کیا آپ کو بھی شک تھا کہ آپ کے سسر کو زہر دیا گیا ہے؟"

اس نے نہایت پختہ اور دو ٹوک لہجے میں کہا ــــ "شک نہیں جی، یقین کریں۔ اس کی بیوی بدمعاش عورت ہے۔ عاشق علی بدمعاش آدمی ہے۔"

جہاں تک شک کا تعلق تھا وہ تو ہو سکتا تھا کیونکہ مقتول بظاہر تندرست تھا اور شک کی دوسری وجہ نوجوان بیوی، اس کے خاوند کا بڑھاپا اور جائیداد تھی۔ مگر جس طرح رفعت اور اس کا خاوند دو ٹوک انداز سے فیصلہ دے رہے تھے، اس طرح تو میں بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے چند اور باتیں پوچھیں۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا

کہ اس شخص کی ذہنیت اور سوچ کیا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی جرح اور گپ شپ سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ چالاک نہیں ہے چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی نظر مقتول کی جائیداد پر ہے جس میں سے وہ اپنی بیوی کا حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس کی بیوی، رفعت نے اپنے باپ سے حصہ مانگا بھی تھا اور باپ نے اسے کہا تھا کہ ابھی جائیداد تقسیم نہیں ہوئی۔ جب کروں گا تو حصہ دے دوں گا۔ اس مطالبے کا علم عاشق علی کو ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو بُرا بھلا کہا تھا اور اسی سلسلے میں عاشق علی اور رفعت کے خاوند کی بھی تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی تھی۔ عاشق علی نے یہ بھی کہا تھا کہ میں جائیداد میں سے ایک اِنچ جگہ نہیں دوں گا۔ راحت نے بھی رفعت اور اس کے خاوند کی بے عزتی کی تھی۔

میں نے اسے باہر بھیج کر رفعت کو بلایا اور اپنا لہجہ ذرا سخت کر دیا۔ میں نے کہا۔ "تمہارا خاوند مجھے کچھ ایسی باتیں بتا گیا ہے جو تم نے دانستہ نہیں بتائیں۔ اب منہ سے جو لفظ نکالو تو یہ سوچ لینا کہ یہ لفظ تمہیں چودہ سال کے لیے جیل میں بند کر سکتا ہے" اس کا رنگ جو پہلے ہی صاف ستھرا تھا گھبراہٹ سے سفید ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں معلوم تھا کہ تمہارے باپ کے جسم میں زہر ہے۔ تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا؟ یہ زہر تم نے دیا تھا؟ تمہارے خاوند نے؟"

وہ سٹپٹا اٹھی۔ ہکلا کر بولی — "آپ سارے محلے سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں اپنے سسرال میں تھی۔ میرا خاوند بھی اپنے گھر تھا" — میں نے اسے جینے نہ دیا۔ جرح کے ایسے ایسے بم پھینکے کہ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور وہ رونے لگی۔ میں نے اسے بالکل تسلی نہ دی اور نہ اس سے کوئی ہمدردی کی۔ اس نے کہا — "مجھ پر یہ احسان کریں کہ میرا

جو کچھ بتاؤں وہ میرے خاوند کو نہ بتائیں۔ میرے سہاگ کا معاملہ ہے۔ بات یہ ہے کہ میرا خاوند ہر لحاظ سے اچھا آدمی ہے۔ اس کے دل میں میری محبت بھی ہے۔ اس میں صرف یہ نقص ہے کہ جائیداد اور روپے پیسے کا لالچی ہے۔ شادی کے بعد اس نے مجھے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں اپنے باپ سے جائیداد کا حصہ مانگوں۔ وہ دراصل چاہتا یہ تھا کہ بازار میں آبا جان کی جو چار دکانیں کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں وہ مجھے دے دیں۔ اس کے علاوہ کچھ نقد رقم دے دیں۔ مجھے یہ مطالبہ پسند نہیں آتا تھا۔ میں ٹالتی رہی۔ اس سے خاوند کا رویّہ بدل گیا۔ خاوند نے مجھے اس قدر پریشان کرنا شروع کر دیا کہ میری اتنی اچھی ازدواجی زندگی جہنم بن گئی۔ میں نے دو تین بار آبا جان سے خاصی رقم لی اور اپنے خاوند کو دی۔ یہ اس کی عادت ہو گئی اور مجھے اکسانے لگا کہ میں آبا جان سے پیسے لاتی رہا کروں۔ اتنے میں آبا جان نے شادی کر لی اور ان پر نئی بیوی کا قبضہ ہو گیا۔ مجھے پیسے ملنے بند ہو گئے۔ . . .

"راحت (سوتیلی ماں) میری ہم عمر تھی اس لیے میں اسے ماں والا احترام نہیں دے سکتی تھی۔ پھر میں نے اسے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ بیہودہ حالت میں دیکھا تو اس کے ساتھ لڑائی ہو گئی۔ میرا بڑا بھائی بھی اس کا مرید بن گیا۔ ادھر خاوند نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا کہ میں آبا جان سے جائیداد کا حصہ مانگوں۔ میں نے مانگا تو آبا جان نے جواب دے دیا۔ بڑے بھائی نے میری بے عزتی کی اور راحت نے بھی مجھے بُرا بھلا کہا۔ وہاں میں نے جانا بہت کم کر دیا۔ خاوند نے مجھے طلاق کی دھمکی دے دی۔ اگر میری ماں زندہ ہوتی تو میں دلیری سے طلاق لے کر اپنے گھر چلی جاتی مگر اب میرے لیے گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ طلاق سے میں اتنا ڈرتی ہوں کہ اس کی جگہ موت کو خوش

ہو کر قبول کروں گی۔ میری ساس اور سسر بھی اپنے بیٹے جیسی ذہنیت کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بیٹے کی حمایت کی اور میرا جینا حرام کر دیا۔ پھر آج صبح ابا جان کے مرنے کی اطلاع ملی اور یہ بھی پتہ چلا کہ ان کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ گزشتہ ایک سال میں ہم سب دیکھ چکے تھے، کہ راحت بڑے بھائی کو مٹھی میں لے چکی ہے اور میرے چھوٹے بھائی تک کو ناپاک کر چکی ہے۔ لہٰذا میرے خاوند نے کہا کہ تمہارے ابا جان قتل ہوئے ہیں۔ ان کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔ میں نے یہ بالکل نہیں سوچا تھا کہ تھانے میں آ کر رپورٹ درج کراؤں گی۔ یہ میرے خاوند نے سوچی تھی اور اس نے مجھے کہا تھا کہ پولیس فوراً آجائے گی پھر تم اپنے بھائی اور راحت کو یہ دھمکی دینا کر مجھے میرا حصہ اور بیس ہزار روپیہ نقد دے دو تو میں کیس واپس لے لوں گی۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھے طلاق کی دھمکی دی۔ طلاق کے تو مرنے تام سے میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آگئی اور آپ کو رپورٹ دی۔ پھر آپ آگئے۔ اب مجھے دوسرا قدم اٹھانا تھا۔ اپنے بھائی کو دھمکی دینی تھی، لیکن آپ نے آ کر ساری کارروائی اتنی جلدی سے کی کہ مجھے اپنے بھائی سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔"

"تمہارا یہ خیال تھا کہ میں بندر ہوں۔" میں نے کہا "تم نے کہا کہ میرے باپ کو زہر دیا گیا ہے تو میں اٹھ دوڑا۔ پھر تم کہتی کہ نہیں، اسے زہر نہیں دیا گیا میں کیس واپس لیتی ہوں تو میں بندر کی طرح واپس آ جاتا۔ تم بھائی سے جائیداد اور رقم اینٹھنے کے لیے مجھے انگلیوں پر نچانا چاہتی تھی۔"

وہ سسکیاں لے کر رونے لگی اور بولی۔ "میں نے آپ کو سچی بات بتا دی ہے۔

میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ طلاق سے بچنے کے لیے کیا ہے۔"

کیا بیٹی باپ کو زہر دے سکتی ہے؟

چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کے خاوند کو میں حوالات میں بند کر دیتا لیکن مجھے اس لڑکی کا خیال آگیا کہ یہ کم بخت اسے طلاق دے دے گا۔ یہ دونوں خوش قسمت تھے کہ مرنے والے کو زہر ہی دیا گیا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ رفعت کے خاوند نے ایک ناٹک کھیلا اور قتل کی ایک واردات بے نقاب ہو گئی ورنہ کسی کو شک تک نہ ہوتا کہ یہ قتل ہے۔ میں نے لڑکی کو الگ بٹھا دیا اور اس کے بیان پر غور کرنے لگا۔ جہاں تک جذبات کا تعلق تھا اس لڑکی نے مجھے متاثر کر لیا تھا۔ لیکن تفتیش جذبات سے نکل کر کی جاتی ہے۔ میں نے رفعت اور اس کے خاوند کو مشتبہ افراد قرار دے دیا۔ یہ ممکن تھا کہ مرتضےٰ (رفعت کا خاوند) نے ہی رفعت کے باپ کو زہر دلا دیا ہو اور رفعت بھی اس میں شریک ہو۔ یہ محض ناٹک نہیں تھا جو مرتضےٰ نے کھیلنے کی کوشش کی تھی میں نے اسے اندر بلایا اور جرح شروع کر دی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ میں اسے بار بار یہی کہتا تھا کہ تمہیں یہ خیال کس طرح آیا کہ رفعت کے باپ کا ہارٹ فیل نہیں ہوا اور اسے زہر دیا گیا ہے۔ اس نے اکھڑے اکھڑے جواب دیئے جنہوں نے مجھے گہرے شک میں ڈال دیا۔ میں نے رفعت کو الگ بٹھا دیا اور مرتضےٰ کو الگ۔ مرتضےٰ سے کہا۔

"اچھی طرح سوچ لو کہ تم اقبال جرم کرنا چاہتے ہو یا میں تفتیش کا لمبا چکر کاٹ کر تم تک پہنچوں۔ اس صورت میں مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔"

"جناب" اس نے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری اس کے ساتھ نہ کوئی دشمنی تھی نہ کوئی لالچ۔ معلوم ہوتا ہے میری بیوی نے آپ کو میرے خلاف کوئی جھوٹی بات بتا دی ہے۔"

"جناب" میں نے اسے کہا۔ "آپ کی بیوی بھی آپ کی طرح مشتبہ ہے اور آپ کی طرح وہ بھی پابند کر لی گئی ہے۔"

میں نے مقتول کے گھر چھاپہ مارا اور تلاشی اس طرح لی کہ ہر ایک ٹرنک اور سوٹ کیس کی ہر ایک چیز دیکھی۔ کوئی کاغذ بغیر دیکھے نہ چھوڑا۔ وہیں راحت کو بٹھا لیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ اقبال جرم نہیں کرے گی۔ اب تو وہ یہ بھی دیکھ چکی تھی کہ خانہ تلاشی میں کوئی ایسی چیز یا تحریر برآمد نہیں ہوئی جو جرم یا مجرم کی نشاندہی کرتی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ دلیر ہو گئی۔ وہ اسی بات پر قائم رہی کہ یہ شادی اس کی مرضی کے مطابق ہوئی تھی اور وہ مقتول کے ساتھ مطمئن اور خوش تھی۔ میں نے عاشق علی اور اس کے چھوٹے بھائی کے متعلق اس کے تعلقات معلوم کرنے کے لیے بہت سے سوال کیے۔ الفاظ بدل بدل کر اسے گھیرنے کی کوشش کی مگر اس نے اصل بات تسلیم نہ کی اور کہا کہ میں ان لڑکوں کی سوتیلی ماں ہوں اور وہ مجھے ماں ہی سمجھتے رہے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "تو کیا تم دوسری شادی کرو گی؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ جسے چاہا تھا وہ مر گیا ہے۔ میں تو اسی گھر میں رہوں گی۔"

میں حیران تھا کہ لڑکی پختہ کار ہے یا اسے کسی نے پختہ کار بنا دیا ہے یعنی جس کی خاطر اس نے خاوند کو زہر دیا ہے، اس نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ پولیس یہ جرم

ثابت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا وہ میرے ہر وار سے اس طرح بچ کر نکل جاتی کہ میں پریشان ہو گیا۔ یہ تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے مگر اس ترے پیر الیقین ہلا ڈالا اور میرے دل میں یہ شک پیدا کر دیا کہ مقتول کو ز فعت اور اس کے خاوند نے زہر دیا ہو گا لیکن میری زیادہ تر توجہ راحت اور عاشق علی پر تھی۔

اس دوران میرے اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے باہر بلایا۔ تلاشی میں وہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے کچھ ہدایات دی تھیں۔ وہ ان پر عمل کر رہا تھا۔ اس نے مجھے شیشے کا ایک گلاس دیا۔ اس کے متعلق ایک دو باتیں بتائیں اور چند باتیں میرے کان میں ڈال دیں۔ میں کمرے میں گیا، راحت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تو میں نے اس کے اور اپنے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر شیشے کا گلاس رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس نے نظریں گلاس پر ڈالیں اور پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے چہرے پر تبدیلی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ جھنجلا کر بولی۔

"یہ گلاس آپ نے میرے آگے کیوں رکھ دیا ہے؟"

"تاکہ تم اسے اچھی طرح پہچان لو۔" میں نے جواب دیا۔ "تم نے پرسوں عاشق علی کے ہاتھ سے یہ گلاس چھین کیوں لیا تھا؟ اسے اس میں پانی کیوں نہیں پینے دیا تھا؟"

اس کی گھبراہٹ بڑی صاف تھی لیکن سنبھل کر بولی۔ "یہ نوکر کا گلاس ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا۔"

میں نے گلاس اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور راحت سے پوچھا۔ "عاشق علی کا اپنے باپ کے ساتھ کیا جھگڑا تھا؟" یہ باتیں نوکر نے اے۔ ایس۔ آئی کو بتائی تھیں۔

"باپ بیٹے کے درمیان کوئی بات ہو گی۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے تو کچھ علم نہیں۔"

میں نے یہ ظاہر کر کے کہ میں نے اس کی ساری باتیں تسلیم کر لی ہیں، اسے باہر بھیج دیا اور عاشق علی کو اندر بلایا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا ــــ "خدا کے لیے مجھے کچھ سمجھائیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک تو والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا دوسرے پولیس نے ہم پر حملہ کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔

"کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ آپ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ کا تو ان کے ساتھ ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ان کی موت پر خوش ہوں۔" اس نے کہا۔ "آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ میرا ان سے ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔"

"کبھی کبھی؟"

"جی کبھی کبھی۔" اس نے کہا ــــ "یہ بھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ ابا جان مجھ سے بگڑنے لگے تھے۔"

"دوسری شادی کے بعد۔" میں نے کہا۔

"جی۔" اس کے منہ سے 'جی' پھسل گیا جسے نگلنے کے لیے اس نے کوئی بات بنانے کی کوشش کی لیکن میں نے ہمدردی اور دانش کے لہجے میں کہا۔

"جو آدمی بڑھاپے میں نوجوان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے وہ اپنے جوان بیٹے کو بھی دشمن سمجھنے لگتا ہے اور اگر بوڑھا صاحبِ جائیداد ہو تو اسے یہ وہم ہو جاتا ہے کہ اس کا جوان بیٹا اس سے اس کی جوان بیوی اور جائیداد چھین لے گا۔ یہی مصیبت آپ کے ہاں پیدا ہو گئی تھی۔" میں نے لہجے میں اور زیادہ درد پیدا کر کے کہا ــــ "آپ پریشان نہ ہوں۔ والد صاحب کا کاروبار سنبھال لیں۔ انہیں شادی کم از کم اس عمر میں

نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ آپ کی بدقسمتی یہ تھی کہ راحت آپ کو بہت چاہتی تھی۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی۔ وہ آخر جوان ہے۔ جوانی انسان کو مجبور کر دیتی ہے۔" میں نے لمبا چوڑا لیکچر شروع کر دیا۔ عاشق علی "جی۔ جی" کہتا رہا۔ میں اس کی کمزوری سے آگاہ تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی کمزوری تھی کہ پولیس اس کے گھر کی تلاشی لے کر اس کے گھر بیٹھی تفتیش کر رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر کو وہ درندہ یا بھوت سمجھ رہا تھا مگر اس بھوت نے انسانوں کی طرح پیار اور ہمدردی کی باتیں شروع کر دیں تو وہ ریت کی ڈھیری بن گیا۔ میں نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا اور اسے اس مقام تک لے آیا کہ اس نے میری اس بات پر بھی 'جی' کہ دی کہ راحت کا چال چلن اچھا نہیں اور اس نے تمہیں اپنی عیاشی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اس کے منہ سے "جی" نکل گئی تو میں نے کسی رّدِ عمل کا اظہار نہ کیا اور کہا۔

"آپ کے والد صاحب کو شاید پتہ چل گیا تھا کہ راحت کے ساتھ آپ کے تعلقات قابلِ اعتراض ہیں۔ جھگڑے کی وجہ یہی تھی اور پھر آپ نے انہیں یہ بھی کہ دیا کہ جائیداد آپ کے نام منتقل کر دی جائے۔ ادھر آپ کی بہن نے اپنے حصّے کا مطالبہ کر دیا۔ اس سے آپ کے والد صاحب اور زیادہ غصے میں آ گئے۔"

"بہن کو تو میں نے بھی ڈانٹ دیا تھا۔" اس نے کہا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ "آپ کو یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟"

"مجھ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔" میں نے اسے کہا اور گلاس اس کے سامنے رکھ کر پوچھا ــــ "اس روز آپ اس گلاس میں پانی پینے لگے تھے تو راحت نے یہ آپ کے ہاتھ سے چھین کیوں لیا تھا؟"

"کہتی تھی کہ یہ نوکر کا ہے۔"

"یہ کہاں رکھا تھا؟"

"باورچی خانے میں" — اس نے جواب دیا ۔"پانی پینے کے لیے میں خود ہی باورچی خانے میں چلا گیا۔ یہ گلاس الگ رکھا تھا۔ میں نے اس میں پانی ڈالا تو راحت آگئی۔ اس نے گلاس میرے ہاتھ سے چھین کر الگ رکھ دیا اور کہا کہ مجھ سے پانی کیوں نہیں مانگا۔ یہ نوکر کا گلاس ہے۔ اس نے مجھے دوسرے گلاس میں پانی ڈال دیا تھا" — اس نے مجھ سے پوچھا — "یہ گلاس آپ نے اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی تو میں نے آپ سے پوچھا ہے" اس نے کہا۔

"اس گلاس میں آپ کے والد صاحب کو زہر دیا گیا تھا" میں نے کہا — "اور یہ بات آپ کے علم میں ہے" — اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اس کے منہ سے سرگوشی نکلی۔ "زہر مجھے علم ہے؟" پھر اس نے آگے جھک کر پوچھا — "آپ نے یہ کیسے کہہ دیا ہے کہ مجھے اس کا علم ہے؟"

میں نے اسے کہا — "آپ مجھ سے سوال نہ پوچھیں۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے چلے جائیں۔ یہ معمہ حل ہو جائے گا۔ اگر آپ میری مدد کریں تو ہم دونوں کا کام آسان ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ پولیس سٹیشن چلتے ہیں"

میں نے راحت کو دانستہ نظر انداز کر دیا۔ اس کے گھر سے نکلتے وقت میں نے اسے کہا — "آپ ناراض تو ضرور ہوں گی لیکن میں اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں" میں اسے حیران اور پریشان چھوڑ کر عاشق علی کو ساتھ لیے تھانے میں چلا گیا۔ میں نے اپنا انداز دوستانہ رکھا۔ اس کی خاطر تواضع کی اور دوستانہ لب و لہجہ میں تفتیش شروع کی۔ شام تک وہ

تو مان گیا کہ راحت کے ساتھ اس کے تعلقات ناجائز تھے اور راحت پردہ پوشی کے لیے مقتول کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتی تھی۔ راحت کے متعلق عاشق علی نے یہ نیا انکشاف کیا کہ اس کا رشتہ انور نام کے ایک آدمی کے ساتھ طے ہوگیا تھا، لیکن راحت کی شادی مقتول کے ساتھ کردی گئی۔ عاشق علی کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔

"ابتدا میں راحت کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کسی جنگلی جانور کو پنجرے میں بند کردیا گیا ہو۔ کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں تھی۔ پہلے تو روتی رہی، پھر اس نے لڑائی جھگڑے شروع کردیئے۔ میں نے اسے بہلانے پھسلانے کی ذمہ داری سنبھال لی تو وہ میرے ساتھ کھل گئی۔ اس نے میرا دماغ بھی خراب کردیا۔ اس کے بعد وہ خوش رہنے لگی۔ وہ آٹھویں دسویں روز اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ اس شخص سے ملتی ہے جس کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔" عاشق علی نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ اس نے پیچھا کرکے راحت کو اس آدمی کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا نام انور تھا اور عمر عاشق علی جتنی یعنی بائیس تئیس سال۔ عاشق علی نے مجھ پر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اپنے باپ کو زہر دینے میں وہ شریک نہیں ہے۔ اس نے بہت سی دلیلیں دے کر یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ راحت نے انور کے ساتھ مل کر اس کے باپ کو زہر دیا ہے۔

اس کی دلیلیں میرے لیے قابل قبول تھیں۔ انور ایک نیا مشتبہ تھا جو میرے سامنے آیا۔ میں نے عاشق علی کو مشتبہ فہرست میں سے خارج نہ کیا لیکن اسے یہ تاثر دیا کہ انور کا نام سامنے آجانے سے میں اب اسے مشتبہ نہیں سمجھتا۔ میرے سامنے اب پانچ مشتبہ افراد تھے۔ رفعت، اس کا خاوند، عاشق علی، راحت اور انور۔

راحت کے متعلق تو یقین ہو گیا تھا کہ زہر اسی نے دیا ہے۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کا ساتھی عاشق علی ہے یا انور۔ مخبروں کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی میری ہدایات کے مطابق اپنی خفیہ کارروائیوں میں مصروف تھا۔ مجھے کوئی سقم نہیں تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ اگلے روز راحت کو باقاعدہ حراست میں لے لوں گا۔ رات کے نو بجے رہے تھے۔ میں نے عاشق علی کو یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ وہ کل نو بجے صبح تھانے میں آ جائے ـــ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ عاشق علی نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس کا باپ کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا اور جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے راحت کے ساتھ بے جا تعلقات تھے۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے باقاعدہ گرفتار نہ کرتا تو تفتیش کا پابند کر کے تھانے میں بٹھائے رکھتا اور اگر اسے گھر ہی بھیجنا تھا تو اس کی حرکات پر نظر رکھنے کے لیے آدمی مقرر کر دیتا۔ میں نے یہ غلطی کچھ سوچ کر ہی کی تھی لیکن غلطی آخر غلطی ہوتی ہے جس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ میں نے عاشق علی کو گھر بھیج دیا اور مجھے وہم تک نہ ہوا کہ یہ میری اور عاشق علی کی آخری ملاقات ہے اور یہ کیس میرے ہاتھ سے نکل کر ان بپھرے ہوئے رہزنوں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ میں چلا جائے گا جو دن دہاڑے انگریزی حکومت کے قانون کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔

میں رات بہت دیر تک تفتیش کا تانا بانا سیدھا کرتا رہا۔ اے۔ ایس۔ آئی سے تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ راحت کو فوراً حراست میں لے لیا جائے۔ لیکن میں اسے صرف حراست میں لے کر اس کے ساتھی کو چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اسے اور اس کے ساتھی کو اکٹھا گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا

کہ یہ قتل راحت نے اکیلے نہیں کیا۔ میں نے اگلے روز شام سے پہلے پہلے راحت اور عاشق علی یا انور کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا تھا ___ اگلے روز نو بجے عاشق علی نہ آیا ...... دس بج گئے تو میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ عاشق اور راحت کو تھانے لے آئے۔ اے۔ ایس۔ آئی کو میں نے انور کے گھر یہ معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا کہ کیا اس کا رشتہ راحت کے ساتھ طے ہوا تھا؟ اور اسے یہ بھی کہا کہ وہ انور کو تھانے میں لے آئے۔ اے۔ ایس۔ آئی کو ایک گھنٹہ بعد جانا تھا کیونکہ ایک اور تفتیش کا کچھ کاغذی کام فوری طور پر کرنا تھا۔ وہ ابھی یہ کام کر رہا تھا کہ کانسٹیبل، عاشق علی کے چھوٹے بھائی اور نوکر کو ساتھ لے آیا۔ سولہ سال کی عمر کا یہ لڑکا بُری طرح رو رہا تھا۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ عاشق علی اور راحت غائب ہیں۔ عاشق علی کے چھوٹے بھائی نے بتایا کہ عاشق علی کو اس نے آخری بار اُس وقت دیکھا تھا جب وہ کل میرے ساتھ تھانے آیا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر نہیں گیا۔ راحت کے متعلق اس نے بتایا کہ شام کے بعد وہ راحت کے ساتھ رہا۔ رات نو بجے کے قریب راحت نے اسے کہا کہ جا کے سو جاؤ۔ وہ اسی کمرے میں سونا چاہتا تھا لیکن راحت نے اسے بہلا پھسلا کر دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد راحت اس کے کمرے میں گئی۔ بتی بجھی ہوئی تھی۔ لڑکا جاگ رہا تھا۔ اس نے راحت کو بلایا تو راحت نے کہا کہ میں تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ سو جاؤ۔ میں عاشق علی کا انتظار کر رہی ہوں۔ لڑکے نے اسے کہا کہ بھائی جان آجائیں تو مجھے جگا دینا۔ مجھے بہت فکر ہے۔ انہیں پولیس لے گئی تھی۔ رات کو اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ عاشق علی آ گیا ہے یا نہیں، اس کے کمرے میں گیا۔ بتی جلائی۔ بستر خالی تھا۔ وہ راحت کے کمرے میں گیا۔ وہ بھی

غائب تھی۔ پھر اس نے حویلی کے سارے کمرے دیکھے۔ بیت الخلا اور غسل خانہ بھی دیکھا دونوں غائب تھے۔ اس نے نوکر کو جگایا اور رات روتے گزار دی۔ صبح وہ راحت کے ماں باپ کے گھر گیا۔ راحت وہاں بھی نہیں تھی بلکہ اس کے ماں باپ یہ سن کر پریشان ہو گئے کہ وہ اور عاشق علی غائب ہیں۔

ماں نے بیٹی کی قیمت وصول کی —— دس ہزار روپیہ

لڑکا اپنے گھر آیا۔ تھوڑی دیر بعد کانسٹیبل عاشق علی کو بلانے چلا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ راحت اور عاشق علی غائب ہیں تو وہ لڑکے کو اور نوکر کو اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔ نوکر نے بتایا کہ اس نے راحت اور اسلم (لڑکے) کو شام کے وقت کھانا کھلایا تھا۔ راحت نے اسے کھانا روزمرہ کے وقت سے خاصا جلدی تیار کرنے کو کہا تھا۔ اس کے بعد اس نے راحت کو نہیں دیکھا۔ عاشق علی کے متعلق بھی اس نے بتایا کہ اس نے اسے نہیں دیکھا—— ان دونوں سے میں نے جو باتیں معلوم کیں ان سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ عاشق علی کو جس وقت میں نے گھر جانے کی اجازت دی تھی، اس سے کوئی ایک گھنٹہ بعد دونوں غائب ہو گئے ہیں اور ہوا یہی ہے کہ عاشق علی گھر گیا تو راحت اسلم کو اس کے کمرے میں بھیج چکی تھی اور پھر دیکھنے گئی تھی کہ وہ سو گیا ہے یا نہیں۔ لڑکے نے اسی کے کمرے میں سونے کو کہا تھا لیکن راحت نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عاشق علی اور راحت نے فرار کا پروگرام پہلے سے طے کر رکھا تھا اور یہ پروگرام اس وقت طے ہوا ہو گا جب میں نے اس کے گھر کی تلاشی لی تھی۔

میں نے لے۔ ایس۔ آئی کو شہر کی ناکہ بندی کے لیے بھیج دیا اور خود دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر راحت کے ماں باپ کے گھر چھاپہ مارا۔ وہاں سے کچھ بھی نہ ملا۔ البتہ کچھ نئی باتیں معلوم ہو گئیں جو مختصراً یوں ہیں کہ راحت کا باپ بھلے مانس اور کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ راحت کی ماں کا اس پر اس قدر رعب تھا کہ بے چارا گھر میں دبکا رہتا تھا۔

راحت کا رشتہ انور کو دیا گیا تھا لیکن مقتول کی نظر راحت پر پڑی تو اس نے اس کا رشتہ مانگا۔ باپ راضی نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے باپ بیٹی پر اپنا فیصلہ ٹھونسا اور شادی مقتول کے ساتھ کر دی۔ ماں نے مقتول سے دس ہزار روپیہ نقد لیا تھا۔ انور نے راحت کے باپ کو قتل کی دھمکی دی۔ باپ نے انور کی منت سماجت کی اور اسے بتایا کہ وہ گھر میں بے بس اور مجبور ہے۔ انور نے پھر راحت کی ماں کو دھمکی دی۔ پھر راحت گھر آ کر انور سے ملنے لگی۔ راحت کے باپ نے تو ساری باتیں بتا دیں لیکن اس کی ماں باتیں گول کر رہی تھی۔ میں نے اسے الگ لے جا کر دھمکی دی کہ وہ صحیح بات نہیں بتائے گی، تو اسے تھانے لے جاؤں گا۔ کچھ تھانے کا خوف تھا اور کچھ میری پوچھ گچھ کا گورکھ دھندا جس نے اس سے تمام باتوں کا اعتراف کرا لیا۔ وہ مان گئی کہ اس نے بیٹی کا دس ہزار روپیہ لیا تھا اور وہ یہ بھی مان گئی کہ راحت شادی کے بعد انور سے ملتی تھی۔ یہ ایک شرط تھی جو راحت نے ماں سے منوائی تھی کہ اسے انور سے ملنے سے نہیں روکا جائے گا۔ ماں نے یہاں تک بتا دیا کہ راحت گھر آتی تھی تو باپ اگر گھر میں نہ ہو تو وہ خود انور کو گھر میں بلا لیتی تھی اور راحت کے پاس الگ کمرے میں بٹھا دیتی تھی۔ انور کے متعلق اس نے بتایا کہ بڑا سخت طبیعت کا آدمی ہے۔ اسے دو تین رشتے ملے جو اس نے ٹھکرا دیئے۔

راحت کے متعلق ماں نے بتایا کہ خاوند کے مرنے کے بعد وہ ادھر نہیں آئی۔

میں انور کے گھر گیا۔ اس کے ماں باپ نے بتایا کہ انور بڑا ضدی لڑکا ہے۔ شادی کا نام نہیں لینے دیتا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے تو باپ نے کہا کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اکثر گھر سے غائب رہتا ہے۔ اتنا خودسر ہو گیا ہے کہ والدین اس کے لیے پریشان ہیں کہ یا اپنی جان لے لے گا یا کسی کو مار ڈالے گا۔ راحت کے باپ نے بتایا کہ اس لڑکی نے لڑکے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ اپنے گھر آتی ہے تو انور کو بلا لیتی ہے۔ اسے کپڑے اور پیسے دیتی ہے۔" باپ نے کہا۔ "مجھے شک ہوتا ہے کہ راحت مقتول کی برائے نام بیوی ہے۔ اس نے اور انور نے درپردہ شادی کر رکھی ہے"۔۔۔ میں نے جب اسے بتایا کہ راحت نے خاوند کو زہر دیا ہے اور وہ لاپتہ ہے، تو باپ رو پڑا اور کہنے لگا۔۔۔ "اس لڑکے نے مجھے جس طرح پریشان کر رکھا ہے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ پھانسی چڑھ جائے۔ رو دھو کر صبر کر لوں گا۔ اب تو محلے، برادری میں اس نے سارے خاندان کو بدنام کر رکھا ہے۔ میں، اس کی ماں اور اس کی بہنیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ یہ بدبخت میرا ایک ہی لڑکا ہے۔"

قاتل قتل ہو گیا ۔۔۔ اور لڑکی؟

ماں باپ کی پریشانی تو اپنی جگہ تھی، میری پریشانی یہ تھی کہ انور بھی لاپتہ، عاشق علی بھی غائب، راحت گئی کس کے ساتھ ہے؟ شہر کی ناکہ بندی بیکار تھی۔ رات کے وقت تین ریل گاڑیاں یہاں رکتی تھیں۔ دو بسیں بھی رات کو یہاں سے روانہ ہوتی تھیں۔ راحت اور اس کے ساتھی کم و بیش دو سو میل دور پہنچ چکے ہوں گے۔ اب مجھے ملزموں کی تصویریں حاصل کر کے مختلف شہروں میں بھیجنی تھیں اور ان کی تلاش کے دیگر

اقدام کرتے تھے۔ وہ دن اسی بھاگ دوڑ میں گزر گیا۔ دوسرے دن دو دیہاتی تھانے میں آئے اور اطلاع دی کہ شہر سے دو میل دُور ایک قدرتی جوہڑ میں ایک شہری کی لاش پڑی ہے۔ کپڑے خون سے لال ہیں۔ میں قتل کی ایک اور واردات رجسٹر کرنے کے لیے چل پڑا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا۔ تانگے میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ یہ دیہاتی مجھے ایسے علاقے میں لے گئے جہاں سے کم ہی لوگوں کا گزر ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں وہ علاقہ ویران تھا۔ سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں اور درخت بھی تھے علاقہ زیرِ کاشت نہیں تھا۔ ایک پگڈنڈی گزرتی تھی جس پر دن کے وقت بیل گاڑیاں یا کوئی پیادہ لوگ گزرتے ہوں گے۔ ورنہ یہ راستہ عام نہیں تھا۔ دُور دُور تک کوئی گاؤں نہیں تھا۔ سنا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے انگریز یہاں سؤر کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ اس وجہ سے بھی انہوں نے اس علاقے کو آباد نہیں ہونے دیا تھا۔

دیہاتیوں نے ایک جگہ تانگہ رکوایا اور مجھے ایک طرف لے گئے کم و بیش ڈیڑھ سو گز دُور ایک جوہڑ کے کنارے لے گئے گدھوں کی چڑ چڑ کی خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لاش کو کھا رہے تھے ___ لاش جوہڑ کے کنارے پڑی تھی وہاں پانی بہت تھوڑا تھا۔ کنارے پر سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں۔ لاش ان میں چھپی ہوئی تھی۔ یہ لاش عاشق علی کی تھی۔ ان دیہاتیوں کو یہ نظر نہیں آسکتی تھی۔ وہ ڈیڑھ سو گز دُور سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ انہوں نے خون گرا ہوا دیکھا۔ زمین پر انہیں ایسے نشان نظر آئے جو صاف بتاتے تھے کہ یہاں کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں سے ایک نمایاں نشان ایک طرف کو جاتا تھا جیسے کسی انسان کو مردہ یا زندہ حالت میں گھسیٹ کر لے جایا گیا ہو۔ خون صاف نظر آتا تھا جو خشک تھا۔ زمین کچی

تھی جس نے میری خوب راہنمائی کی۔ ان دیہاتیوں نے گدھوں کو اترتے دیکھا تو وہاں تک گئے اور انہیں عاشق علی کی لاش نظر آئی۔ گدھ صرف اس کی ٹانگیں کھا سکے تھے۔ کیونکہ لاش پانی میں پڑی تھی۔ ٹانگیں کنارے پر تھیں اور اس کے تین طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ گدھوں کے لیے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ چہرہ بالکل صحیح حالت میں تھا۔ قمیض خون سے لال تھی۔ لاش گھسیٹ کر باہر نکلوائی۔ جسم دیکھا. چاقو یا خنجر کے کئی گہرے زخم تھے۔ میں لاش گھسیٹنے کا نشان دیکھتا اس جگہ پہنچا جہاں سے لاش گھسیٹی گئی تھی۔ وہاں مجھے کچھ اور نشان نظر آئے۔ میں کھوجی نہیں تھا۔ پاؤں کے نمایاں نشان تو دیکھ سکتا تھا بچھا ہوا کھرا اٹھانا میرے لیے مشکل تھا۔ وہاں نشان صاف تھے۔ لڑائی ہوئی تھی۔ عاشق علی گرا اور اسے مارنے والا یا مارنے والے گھسیٹ کر جوہڑ میں پھینک گئے تاکہ راستے سے ہٹ جائے۔

خدا کی ذات کے سوا عینی شاہد کوئی نہیں تھا۔ مجھے زمین سے گواہی لینی تھی۔ زمین کی زبان تو نہیں ہوتی لیکن جہاں انسان کا خون گرتا ہے، وہاں سے زمین بولتی ضرور ہے اور یہ زبان سمجھنے والے کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں کھوجی کہتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں ایک مشہور بوڑھا کھوجی تھا جس نے انگریز پولیس افسر کو بھی حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے لیے تانگہ بھیجا اور میں زمین کو دیکھنے لگا۔ فوری طور پر مجھے جو بات سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ عاشق علی راحت کے ساتھ ادھر سے گزرا اور رہزنوں کے ہتھے چڑھ گیا اور وہ اسے قتل کر کے راحت کو لے گئے۔ اُس زمانے میں پیشہ ور ڈاکوؤں اور رہزنوں کے گروہ ہوتے تھے۔ یہ اُن تاریخی

ڈاکوؤں کی اولاد یا شاگرد تھے جو جنگلوں کے وسیع علاقوں میں حکمرانی کرتے تھے۔ انگریزوں نے فوج کی مدد سے علاقے صاف کیے تھے۔ مگر ابھی تک یہ پیشہ زندہ تھا جہاں عاشق علی کی لاش پڑی تھی وہاں سے ایک میل دور جنگل شروع ہوتا تھا جس میں کھڈ نالے اور اونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں۔ میں یہی کچھ سمجھ سکا کہ یہ پیشہ ور رہزنوں کی واردات ہے جن میں دو اشتہاری مجرم تھے۔ ایک ٹنڈل کہلاتا تھا اور دوسرا اُمنا بادشاہ۔ یہ پکڑے نہیں جاتے تھے۔ ان کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان کے پاؤں میں چکر تھا اور پولیس کو بھی وہ اسی چکر میں الجھائے رکھتے تھے۔ مگر سوچنے والی بات یہ تھی کہ عاشق علی راحت کو لے کر کہاں جا رہا تھا۔ وہ اس طرح ویرانے میں کس طرح پہنچ گئے؟ کیا یوں ہوا ہوگا کہ ڈاکوؤں نے انہیں ریلوے سٹیشن سے ڈرا دھمکا کر ساتھ لیا اور یہاں آکر اسے قتل کر گئے اور راحت کو ساتھ لے گئے؟

میں زمین کے نشان دیکھ دیکھ کر یہ معمہ حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے کچھ اور نشان نظر آئے۔ یہ تانگے کے پہیوں کے نشان تھے۔ ایک تو ہمارے تانگے کے نشان تھے جو تازہ ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ یہ ایک جگہ آکر ختم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ پہیوں کے جو نشان تھے وہ بتاتے تھے کہ ایک تانگہ آیا جو ایک طرف ہٹ کر رک گیا۔ گھوڑے کے کھُرے صاف تھے۔ ایک اور تانگہ اس سے دائیں کو قریب آکر رکا۔ وہاں سے انسانی پاؤں کے نشان شروع ہوئے۔ میں نے بیٹھ کر یہ کھُرے دیکھے۔ ایک کھُرا عورت کا تھا۔ پاؤں چھوٹا تھا۔ پھر یہ سارے کھُرے گڈمڈ ہو گئے۔ وہاں سے قریبی گاؤں تین میل دور تھا۔ کوئی دو گھنٹے بعد

بوڑھا کھوجی آ گیا۔ وہ پیچھے چلا گیا اور وہاں سے زمین کو دیکھتا واردات کی جگہ تک آیا۔ تین چار چکر وہاں کاٹے اور یہ کہانی سنائی ۔۔۔ "آگے پیچھے دو تانگے آ رہے تھے۔ اگلا تانگہ راستے سے ہٹ کر رُکا۔ دوسرا تانگہ راستے پر آ کر ذرا آگے رکا۔ راستے سے ہٹ کر رکنے والے تانگے میں سے ایک مرد اور ایک عورت اُتری۔ دوسرے تانگے سے صرف ایک مرد اترا پھر ان کی لڑائی ہوئی۔ لڑکی گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر چلتی رہی۔ پھر ایک آدمی گرا۔ عورت اور مرد لاش کے قریب اکٹھے کھڑے ہوئے۔ دونوں نے لاش گھسیٹی اور پانی میں پھینک آئے"۔۔۔ کھوجی نے مجھے تانگے واپس جانے کے نشان بتائے۔ پہیوں کے نیم دائرے کے نشان نظر آ رہے تھے۔

میں اسے جوہڑ تک لے گیا۔ وہاں سے اس نے کھرا اٹھایا اور کہا۔ "عورت قاتل کے ساتھ جا رہی ہے"۔

"عورت کو یہاں سے گھسیٹا نہیں جا رہا؟" میں نے پوچھا۔ "آدمی کتنے ہیں؟"

"آدمی صرف ایک ہے"۔ اس نے کہا ۔۔۔ "عورت اپنی مرضی سے جا رہی ہے"۔ اس نے عورت کا کھرا دکھا کر کہا ۔۔۔ "یہ کھرا پہچان لیں۔ اس کے قدموں کا فاصلہ ناپیں۔ ہر قدم کا فاصلہ ایک جیسا ہے۔ رفتار تیز ہے۔ مرد آگے ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ عورت ہنسی خوشی جا رہی ہے" ۔۔۔ آگے زمین پتھر کی طرح سخت تھی۔ جہاں کھرا ڈھونڈنا پڑا۔ بوڑھے کھوجی نے ڈھونڈ لیا۔ ایک میل تک کھرا گیا اور کھوجی رک گیا۔ میں نے بھی دیکھا کہ وہاں گھوڑے کے پاؤں کے نشان تھے اور انسانی پاؤں کے بھی۔ کھوجی وہاں بیٹھ گیا اور بڑی ہی غور سے انسانوں کی جوتیوں کے

نشان دیکھنے لگا۔ اس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا ۔۔۔ "مارا گیا۔"

میں نے پوچھا ۔۔۔ "کون ؟"

اس نے جواب دیا ۔۔۔ "شہری مارا گیا۔ پیچھے جو نشان ہیں وہ شہری جوتی کے ہیں۔ یہ نشان دیہاتی جوتیوں کے ہیں۔ میں ان کھروں کو پہچانتا ہوں۔ جوانی سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ ڈاکوؤں کے کھرے ہیں۔ مجھے شک ہے۔ یہ ٹنڈل کے آدمی ہیں۔ مثلاً بادشاہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ ڈاکو ہیں۔" اس نے کھرے اور غور سے دیکھے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ چھڑی کھروں پر رکھ رکھ کر وہ مجھے بتانے لگا ۔۔۔ "انہوں نے عورت کو پکڑا ہے۔ عورت جس کے ساتھ تھی . . . یہ دیکھو . . . . وہ عورت کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھا ہے۔ یہ دیکھو . . . اسے گھونسہ پڑا ہے یا دھکہ ۔ وہ یہاں تک پیچھے ہٹا ہے" ۔۔۔ غرض وہ مجھے سمجھاتا رہا کہ یہاں اس آدمی کو ڈاکو مل گئے اور انہوں نے اس سے عورت چھین لی ۔ وہ ان سے لڑتا رہا اور ڈاکو اسے ساتھ لے گئے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ آدمی بھی ڈاکوؤں کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ وہ اکیلے ہی عاشق علی سے عورت چھین کر یہاں اپنے ساتھیوں سے آملا ہو گا۔

کھوجی نے کہا "نہیں ۔ وہ سولہ آنے شہری ہے۔ یہاں اسے ڈاکو ملے ہیں اور اس سے عورت چھین لی ہے۔ کھرا بتاتا ہے کہ یہاں زبردستی ہوئی ہے۔"

ڈاکوؤں نے لڑکی کی شلوار اور قمیض
مجھے تحفے کے طور پر بھیجی

اور آگے گئے تو جنگل اور چٹانیں شروع ہو گئیں۔ درختوں کے جھنڈ گھنے تھے

وہاں بعض جگہیں بہت خوبصورت تھیں۔ ہری گھاس بھی تھی۔ بھنگ کے پودے بے شمار تھے۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ کھوجی نے گھاس پر بھی کھرا دیکھ لیا جو مجھے بالکل نظر نہیں آیا۔ ہم بہت اندر چلے گئے۔ کھوجی ایک جگہ رک گیا۔ اس نے مجھے گھاس دکھائی جو ذرا دبی دبی سی تھی۔ اس نے مجھے یہ گھاس غور سے دیکھنے کے لیے کہا تو میں نے اور زیادہ غور سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا گیا تھا۔ وہاں سے کوئی چالیس قدم آگے گئے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں گروہ کے آدمیوں نے قیام کیا تھا۔ دیسی شراب کی دو خالی بوتلیں اور بہت سی ہڈیاں پڑی تھیں۔ سگریٹوں کے بہت سے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ لڑکی کو ڈاکو لے گئے ہیں اس لیے آگے جانا بیکار تھا۔ میری سمجھ میں یہ آیا کہ عاشق علی راحت کے ساتھ تانگے میں فرار ہو گیا تھا تو اسے انور نے دیکھ لیا۔ اس نے دوسرے تانگے میں اس کا تعاقب کیا اور یہاں آکر اسے پکڑ لیا۔ انور کے متعلق اس کے گھر سے پتہ چلا تھا کہ گھر سے غائب ہے۔ اور اس کے ماں باپ سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وہ قتل کی دھمکیاں دیتا پھرتا تھا۔ اس نے راحت کے باپ کو قتل کی دھمکی دی تھی اور راحت کی ماں کو اس نے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ اس نے اسے اپنی بیٹی کے ساتھ بند کمرے میں ملنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس سے یہ رائے قائم کی جا سکتی تھی کہ انور میں قتل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ جائے قتل پر ڈاکوؤں کا کوئی کھرا کھوج نہیں تھا۔ اب سوچنا یہ تھا کہ انور اور عاشق علی اس ویرانے میں کس طرح آنکلے؟ یہ سراغ صرف اس صورت میں مل سکتا تھا کہ ڈاکوؤں کو پکڑا جائے لیکن یہ کام بے حد مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ ان کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔

آپ یہ سن کر شاید حیران ہوں کہ ان پیشہ ور رہزنوں اور ڈاکوؤں کے ساتھ ہم رابطہ

قائم کر لیا کرتے تھے۔ یہ رابطہ خاص قسم کے مخبروں کے ذریعے ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے کھوجیوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض وارداتوں کی سراغ رسانی میں پیشہ ور گروہ ہماری مدد بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ معلوم کروں کہ یہ کس کا گروہ ہے اور پھر اس کے سربراہ سے رابطہ قائم کر کے کہوں کہ لڑکی اور لڑکا مجھے واپس کر دے کیونکہ یہ دونوں قتل کے مجرم ہیں۔ یہ ڈیوٹی بوڑھے کھوجی نے اپنے ذمے لے لی۔ ڈاکوؤں کی مدد حاصل کرنے کے لیے شرط یہ ہوتی تھی کہ انہیں دھوکے سے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ ایسے واقعات بھی ہوئے تھے کہ کسی پولیس انسپکٹر نے کسی ڈاکو کو پیغام دے دیا اس سے مدد لینے کے بہانے اسے گرفتار کر لیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد پولیس انسپکٹر نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ میں نے بھی ایک گروہ کے دو افراد کو ایک بار گرفتار کیا تھا۔ ایک کو سزائے موت اور دوسرے کو دو دفعات میں سات سات سال سزائے قید دلوائی تھی لیکن یہ دھوکہ نہیں تھا۔ یہ میرے اے۔ ایس۔ آئی اور چھ کانسٹیبلوں کا کارنامہ تھا جس میں دو کانسٹیبل گولیوں سے زخمی ہو گئے تھے۔ یہ ڈاکو اس علاقے کے ایک مشہور ڈاکو ٹنڈل کے ایک گروہ کے افراد تھے۔ ٹنڈل نے مجھے یہ پیشکش کی تھی کہ بیس ہزار روپیہ نقد لے لوں اور جس قسم کی لڑکی کی خواہش کروں وہ بھی مجھے جتنے عرصے کے لیے چاہوں پیش کی جائے گی۔ میں اس کے دونوں آدمی چھوڑ دوں۔ یہ دونوں اس کے استاد ڈاکو تھے۔ میں نے یہ پیشکش قبول نہیں کی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا کہ راحت اور انور ٹنڈل کے قبضے میں ہیں۔ یہ اطلاع مجھے واردات کے تیسرے روز ملی تھی۔ بوڑھے کھوجی نے ٹنڈل کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ میں نے اسے گھوڑا مہیا کیا تھا۔ ان کی ملاقات ایک جنگل میں ہوئی تھی۔ میں نے ٹنڈل کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مخبر نے بتایا بڑا خوبرو

اور زبردست جسم کا جوان ہے۔ کھوجی نے بڑی مشکل سے اس تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس نے ٹنڈل کو اس کے جاننے والے ایک آدمی کے ذریعے میرا پیغام بھجوایا تھا کہ لڑکی اور زیور مجھے واپس کر دو۔ یہ میرے ملزم ہیں۔ ٹنڈل یہ سن کر کھوجی سے ملنے آگیا۔ اس نے کپڑوں کا ایک بنڈل بوڑھے کھوجی کو دے کر کہا۔

"یہ احمد یار خان کو دے دینا اور اسے کہنا کہ تم نے مجھ پر کون سا احسان کیا تھا کہ میں تمہیں اتنا قیمتی مال واپس کر دوں اور اسے یہ بھی کہنا کہ میں نے مفت کام کرنے کو تمہیں کہا تھا۔ میں نے وہ قیمت پیش کی تھی جو تم ساری عمر خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے بیس ہزار روپے آج کے ایک لاکھ روپے کے برابر تھے۔ اس نے یہ بھی کہا۔

"احمد یار خان کو یہ بھی کہہ دینا کہ تمہارا سکھ تھانیدار اور سپاہی واقعی دلیر لوگ ہیں، جنہوں نے میرے آدمیوں کا مقابلہ کر کے میرے دو آدمی پکڑے تھے۔ میں ملک کی (میری) ایمانداری اور بہادری کی تعریف کرتا ہوں۔ یہ تحفے لے جاؤ اور اسے بتا دینا کہ لڑکی اب ہمیشہ کے لیے میری ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا اس کی لاش کسی روز تمہیں مل جائے گی۔"

بوڑھا کھوجی یہ پیغام لایا اور کپڑوں کا بنڈل مجھے دیا۔ کھول کر دیکھا۔ اس میں راحت کی قمیض، شلوار اور دوپٹہ تھا۔ میں نے یہ کپڑے پہچان لیے۔ جس رات وہ بھاگی تھی، اس روز اس نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ میری طبیعت میں پوٹھوہار کا اکھڑپن تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ دھوکے میں پکڑوں یا مقابلے میں، ٹنڈل کو ضرور پکڑوں گا، خواہ کتنے عرصے بعد موقع ملے۔ اسے چھوڑوں گا نہیں۔ میں فوری طور پر اس کے خلاف کوئی

کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ بوڑھے کھوجی کی اپنی اور اس کے خاندان کی جان کا خطرہ تھا۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ اس کیس کی کیا رپورٹ تیار کروں۔ مجھے اب یہ یقین کرنا تھا کہ راحت کے ساتھ جو آدمی ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گیا تھا وہ انور ہی تھا اور مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ راحت، عاشق علی اور انور اس ویرانے میں کس طرح پہنچے؟ میرا اے۔ ایس۔ آئی تین روز سے وہ دو تانگے ڈھونڈ رہا تھا جو اس ویرانے میں گئے تھے۔ شہر بہت بڑا نہیں تھا۔ بڑی قسم کا قصبہ تھا۔ شہر میں لائسنس یافتہ تانگوں کی تعداد ایک سو نوے تھی۔ میرے پورے سٹاف نے تین دنوں میں تقریباً ہر ایک تانگے والے سے پوچھ لیا لیکن کسی نے بھی نہ بتایا کہ وہ اس ویرانے میں سواری لے گیا تھا۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ قتل تانگے والوں کے سامنے ہوا ہے۔ اس لیے وہ ڈر گئے ہیں۔ انور کے گھر سے اس کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ ابھی تک لاپتہ ہے۔

تانگہ بانوں کا ایک نمبردار تھا۔ میں نے اسے تھانے بلایا اور کہا کہ یہ دو تانگہ بان ڈھونڈ دے۔ وہ ملزم نہیں گواہ ہیں۔ اگر کل بارہ بجے تک وہ تھانے میں نہ آئے تو شہر کے تمام تانگوں کے لائسنس منسوخ کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تمام کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ تمام تانگے بانوں سے کہہ دیں کہ کل صبح لائسنس لے کر تھانے آ جائیں۔ اور انہیں خبردار کر دیں کہ جو غیر حاضر ہوا، اس کا لائسنس منسوخ ہو جائے گا۔ اگلی صبح تھانے کے سامنے تانگے جمع ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک تانگہ بان سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ایک تانگہ میرا تھا جو اس رات ایک جوان لڑکی اور ایک جوان آدمی کو شہر سے باہر لے گیا تھا۔ اس نے اس تانگہ بان کا نام بھی بتا دیا جس کا تانگہ اس کے پیچھے گیا تھا۔ میں نے دوسرے کو بھی پکڑ لیا۔ یہ بے چارے ڈرتے تھے کہ اعانتِ جرم میں نہ دھر لیے جائیں...

میں نے انہیں تسلی تشفی دی اور یقین دلایا کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ جس تانگے میں راحت ایک آدمی کے ساتھ (جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ انور ہی ہو سکتا ہے) بیٹھی تھی، اس کے تانگہ بان نے بیان دیا کہ رات نو اور دس بجے کے درمیان ایک جوان آدمی نے اسے روکا اور شہر سے باہر چلنے کو کہا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو اس نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک درخت کے پیچھے سے ایک لڑکی سامنے آئی اور بہت تیز تیز چلتی تانگے میں بیٹھ گئی۔ وہ آدمی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا۔ وہاں بجلی کے بلب کی روشنی تھی۔ میں تانگہ چلانے لگا تو وہ بہت تیزی سے تانگے کے سامنے آ گیا اور مجھے کہا ——"روکو تانگہ"—— وہ پیچھے گیا۔ اس نے شاید لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ اس نے لڑکی سے پوچھا ——"راحت کہاں جا رہی ہو؟"

لڑکی کی جگہ اس کے ساتھی نے جواب دیا ——"زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہاں سے غائب ہو جاؤ"—— اور اس نے مجھے کہا ——"چلو بھئی تم کیوں رک گئے"—— میں نے تانگہ چلا دیا۔ وہ آدمی چند قدم میرے تانگے کے پیچھے چلا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا ——"دیکھو راحت، یہ ٹھیک نہیں"—— اور دو تین بار اس نے کہا ——"انور، تم بھاگو کہاں تک بھاگتے ہو۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں"—— تانگے میں بیٹھے ہوئے آدمی نے مجھے کہا ——"ذرا تیز چلو نا یار۔ دُگنے پیسے دوں گا"—— میں نے گھوڑے کو بھگا دیا۔ آگے سے ایک خالی تانگہ آ رہا تھا۔ مجھے آواز سنائی دی ——"اوئے ٹھہرو"—— میری سواری نے مجھے کہا ——"دوست منہ مانگے پیسے دوں گا، گھوڑے کو کھلا چھوڑ دو"—— ہمیں کبھی کبھی ایسی سواری مل جاتی ہے جس سے ہم منہ مانگے دام اور انعام لے لیا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دو جوان اس لونڈیا پر لڑ رہے ہیں۔ خدا کی قسم میں یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ کرائے کی لونڈیا ہے یا دونوں کی سانجھی

دوست ہے۔ اسی لیے وہ مجھے شہر سے باہر جانے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ دوسرا تانگہ میرے پیچھے بھاگا آرہا تھا۔ میری مرد سواری نے مجھ سے پوچھا کہ آخری بس کتنے بجے شہر سے نکلتی ہے۔ میں نے بتایا کہ ساڑھے دس بجے اڈے سے چلتی ہے۔ اس نے کہا کہ ہمیں شہر سے دو میل دور اتار دینا۔ ہم کچی سڑک پر جارہے تھے۔

پیچھے والا تانگہ قریب آگیا تھا۔ میری سواری نے گھبرا کر کہا ــــ "تانگہ سڑک سے اتار لو۔ دائیں طرف چلو"ــــ میں نے اس کی مجبوری دیکھ کر کہا ــــ "بابو، بیس روپے لوں گا"ــــ لڑکی نے اسی وقت دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیئے اور کہا ــــ "اور تیز چلو"ــــ میں نے تانگہ اس ویرانے کی طرف دوڑا دیا۔ لڑکی نے اس سے پوچھا ــــ "کہاں لے جا رہے ہو؟ بس تو سڑک سے ملے گی"ــــ اس نے جواب دیا ــــ "وہ ہمارے پیچھے آرہا ہے۔ میں ذرا اسے ٹھکانے لگا لوں۔ اگر سیدھے سڑک پر گئے تو وہ بھلا ہمیں بس میں بیٹھنے دے گا؟"ــــ میں تانگہ بھگا کے شہر سے دو میل دور ویران علاقے میں نکل گیا۔ دوسرا تانگہ بالکل قریب آگیا تھا۔ میرا گھوڑا رہ گیا۔ اس کی رفتار سست ہونے لگی تو میں نے کہا کہ بس جناب، اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ میں نے تانگہ ایک طرف کرکے روک لیا۔ اس آدمی نے چاقو نکال لیا۔ چاندنی میں مجھے چاقو اچھی طرح نظر آگیا۔ خاصا بڑا چاقو تھا۔ اس نے چاقو میری طرف کرکے مجھے گالی دی اور کہا ــــ "اگر نہ چلے تو قتل کردوں گا"ــــ اتنے میں دوسرا تانگہ میرے قریب آرکا۔ اس میں سے دوسرے آدمی نے چھلانگ لگائی اور میری سواریوں کو للکارا۔ میرے تانگے سے آدمی باہر کود پڑا اور اس نے چاقو کا وار کیا۔ وہ آدمی دوڑ کر تانگوں سے پرے چلا گیا۔ میرے والا آدمی اس پر جھپٹ پڑا۔ لڑکی بھی اتر گئی۔ میں نے اپنا تانگہ موڑا اور دوسرے تانگہ بان سے کہا "بھاگ

یہاں سے بھائی، یہ معاملہ تو سنگین ہے"۔۔۔ اور ہم وہاں سے بھاگ آئے۔

دوسرے تانگہ بان نے بیان دیا کہ اسے ایک آدمی نے روکا اور کہا کہ اس تانگے کو پکڑنا ہے۔ جو مانگو گے دوں گا۔ میں نے اس سے پچیس روپے مانگے، وہ مان گیا۔ میں نے گھوڑا دوڑا دیا اور اس سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک آدمی ہمارے محلے کی ایک لڑکی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنا ہے اگلا تانگہ کچے میں اتر گیا تو میں نے تانگہ سڑک سے اتار کر اس کے پیچھے ڈال دیا۔ اس آدمی نے مجھے کہا۔۔۔ "اگر اس سے لڑکی چھیننے میں تم میری مدد کرو تو میں تمہیں پچاس روپے الگ انعام دوں گا"۔۔۔ میں نے سودا قبول کر لیا۔ بہت دور جا کر اگلا تانگہ رک گیا۔ میں نے اپنا تانگہ اس کے قریب روکا۔ وہ میرے تانگہ سے کود کر اترا اور مجھے کہا۔۔۔ "آجاؤ دوست"۔ اور اس نے للکار کر کہا۔۔۔ "آجا انور، اب دیکھتا ہوں تم بھاگ کر جاؤ گے کہاں"۔۔۔ میں ابھی تانگے میں سے اتر ہی رہا تھا کہ دوسرے تانگے سے ایک آدمی نکلا۔ شاید وہی انور تھا جسے میری سواری نے للکارا تھا۔ چاندنی بڑی صاف تھی۔ اس نے چاقو کا وار میری سواری پر کیا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ اس کی مدد کرتا۔ وہ ایک طرف دوڑا تو دوسرے آدمی نے اسے جا لیا اور اسے چاقو پر چاقو مارنے لگا۔ اس آدمی نے شور شرابا کیا۔ ہائے ہائے بھی کی۔ اتنے میں دوسرے تانگہ بان نے اپنا تانگہ موڑا اور مجھے پکار کر کہا۔ "بھاگ یہاں سے بھائی"۔ اور ہم تانگے موڑ کر وہاں سے بھاگ آئے۔ میں پچاس روپوں کے لالچ میں اپنی سواری سے پچیس روپے کرایہ بھی نہ لے سکا۔

دونوں تانگہ بانوں کے بیانوں سے میری اور کھوجی کی قیاس آرائی صحیح نکلی۔ میرا خیال تھا کہ لڑکی کو عاشق علی لے جا رہا تھا لیکن وہ انور تھا۔ اس وقت

عاشق علی تھانے سے گھر جا رہا تھا۔ تانگے بانوں کے بیان کے مطابق یہ وہی وقت تھا، جب میں نے عاشق علی کو تھانے سے گھر جانے کی اجازت دی تھی اور اسے کہا تھا کہ صبح نو بجے تھانے میں پہنچ جانا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھانے سے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں اسے انور اور راحت تانگے میں بیٹھے نظر آئے۔ انور نے یہ سوچا تھا کہ اڈے سے بس پر سوار ہونے کی بجائے وہ شہر سے باہر بس روک کر سوار ہو جائے گا، جہاں اسے اور راحت کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ معلوم نہیں ان کی منزل کیا تھی۔ عاشق علی قتل ہو گیا۔ راحت اور انور کو ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے اور ٹنڈل نے مجھے پیغام بھیجا کہ انور کی لاش تمہیں مل جائے گی۔ اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ عاشق علی کے باپ کو زہر راحت نے دیا اور انور اس کے جرم میں شریک تھا۔ راحت نے عاشق علی کو عیاشی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ وہ دراصل انور کو چاہتی تھی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں ملزموں کو زندہ پکڑنا تھا جو بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ٹنڈل کو پکڑنے کے لئے مجھے پولیس کی زیادہ نفری کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے ایس۔ ایچ۔ او کو پاس بٹھا کر واردات کی تفتیش اور اس دوران پیدا ہونے والے حالات کی تفصیلی رپورٹ تیار کرنی شروع کر دی۔ میں یہ رپورٹ ہیڈ کوارٹر کو بھیج کر وہاں سے کافی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ ٹنڈل کو پکڑ سکوں۔

دن بھر ہم رپورٹ لکھتے رہے۔ رات کو میں ذرا جلدی سو گیا۔ کئی دنوں کی مسلسل بھاگ دوڑ نے تھکا دیا تھا۔ کانسٹیبل نے جب مجھے جگایا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ مجھے اطلاع دینے آیا تھا کہ ایک لاش ملی ہے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا کوارٹر سے دفتر کی طرف چلا تو کانسٹیبل نے کہا۔ "اُدھر نہیں ملک صاحب، اِدھر"۔ وہ مجھے تھانے کے احاطے

سے باہر اور پھر پچھواڑے لے گیا۔ وہاں ایک اور کانسٹیبل کھڑا تھا اور اس کے قریب ایک بوری رکھی تھی۔ بدبو بتا رہی تھی کہ اس میں لاش ہے۔ ادھر سے گزرنے والے ایک آدمی نے جو بوری کے قریب کھڑا تھا یہ بوری دیکھی تھی۔ بوری کا منہ بند تھا۔ اس آدمی نے ہاتھ لگایا اور اسے بدبو بھی آئی تو اس نے تھانے میں اطلاع دی۔ میں نے بوری کھلوائی۔ اندر سے ایک لاش نکلی۔ اس کے گھٹنے سینے پر تھے اور سر کاٹ کر الگ رکھا ہوا تھا۔ بوری میں سے ایک کاغذ نکلا جس کا سائز بچوں کی کاپی کے کاغذ جتنا تھا۔ بھدے سے حروف میں اس پر ہندی زبان میں میرا نام ادھورا لکھا ہوا تھا — "ملک یار خان کو ملے" — نیچے لکھا تھا — "تمہاری امانت واپس ہے۔ رسید پرچہ نہیں چاہیے۔ اس کو ہم نے سزا دے دی ہے۔ اس نے قبولا ہے کہ لڑکی کے خاوند کو اس نے لڑکی کے ہاتھ سے زہر پلایا تھا۔ پھر اس نے لڑکی کو گھر سے بھگایا ہے اور راستے میں ایک اور آدمی کو قتل کیا ہے۔ لڑکی راضی خوشی ہے اس کا فکر تم مت کرو — ٹنٹل"۔ یہ لاش رات کے وقت ڈاکو رکھ گئے تھے۔

میں لاش تھانے لے گیا۔ انور کے باپ کو بلایا۔ اسے لاش کا چہرہ اس طرح دکھایا کہ میں نے اس کا کٹا ہوا سر اس کے کندھوں کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ اس کی ٹانگیں سیدھی نہیں ہو رہی تھیں کیونکہ اکڑ گئی تھیں۔ میں نے اوپر چادر ڈال دی تھی۔ صرف چہرہ ننگا رکھا۔ اس کے باپ کو یہ نہیں بتایا کہ سر الگ ہے۔ اس نے چہرہ دیکھا تو اچانک چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ باپ جلدی ہوش میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ یہ اس کے بیٹے انور کی لاش ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا۔ یہ شخص بارہ تیرہ روز بعد بیان دینے کے قابل ہوا تھا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔

ٹنڈل ڈاکو نے الوز کی لاش بھیج کر اور لڑکی کو اپنے پاس رکھ کر مجھے چیلنج کیا تھا، جو میں نے قبول کر لیا اور تہیہ کر لیا کہ ٹنڈل کو اپنے ہاتھوں پکڑوں گا۔ میں نے پلان بنانا شروع کر دیا۔ ٹنڈل اور اس کے گروہ کی نقل و حرکت کی اطلاعیں دینے کے لیے مخبروں کا جال بچھا دیا۔ دو مہینے بعد مجھے اطلاع ملی کہ ٹنڈل اپنے سات آدمیوں کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ میں نے رات کے وقت دس کانسٹیبلوں کی مسلح نفری سے چھاپہ مارا مگر معلوم ہوتا تھا کہ مخبری دوغلی ہوئی ہے۔ ٹنڈل کو اطلاع مل چکی تھی کہ میں آ رہا ہوں۔ وہ بھاگ سکتا تھا لیکن اس نے میرے مقابلے کے لیے مورچہ بندی کر لی تھی۔ اس نے گاؤں کا گھیرا مکمل ہونے ہی نہیں دیا۔ پہلی گولی اس کی طرف سے آئی۔ پھر دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ گاؤں کے اندر گئے تو ٹنڈل اور اس کے سارے آدمی نکل گئے تھے۔ اگر میرے ساتھ پنجابی اور پٹھان کانسٹیبل ہوتے تو میں ضرور کامیاب ہو جاتا مگر میرے ساتھ صرف ایک مسلمان اور ایک سکھ کانسٹیبل تھا باقی پانچ ہندو تھے۔ اس کے بعد مجھے کوئی موقعہ نہ ملا کیونکہ ایک ہی مہینہ بعد مجھے ایک لمبی سپیشل ڈیوٹی پر دلّی بھیج دیا گیا۔

یہ خونی ڈرامہ ایک بوڑھے آدمی کی ہوس کی وجہ سے کھیلا گیا جس نے دس ہزار روپے کے عوض نوجوان لڑکی سے شادی کی۔ وہ خود قتل ہوا۔ اس کا جوان بیٹا بھی قتل ہوا، ایک اور ماں باپ کا اکلوتا جوان بیٹا ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور وہ نوجوان لڑکی جسے کسی باعزت گھر میں آباد ہونا تھا، ہمیشہ کے لیے ایک ڈاکو کی داشتہ بن گئی۔

وہی سیڑھیاں وہی زہر

دونو قتل ایک ہی لڑکی کے گرد گھومنے لگے۔ تیسرا قتل احمد یار خان نے اپنے ہاتھوں کر دیا ــــ وہ کہتے ہیں یہ نیکی تھی۔ کیا یہ واقعی نیکی تھی؟

یہ کیس متعلقہ تھانے کو دینے کی بجائے سیدھا ہمیں دے دیا گیا، اس حکم کے ساتھ کہ متعلقہ تھانہ کیس رجسٹر کرے گا اور ہماری مدد کرے گا۔ یہ حکم معمول کے کچھ خلاف تھا لیکن انگریز دفتری کارروائیوں کے چکر میں نہیں پڑا کرتا تھا۔ قتل کی واردات ہو جائے تو انگریز افسر ہماری جان کھا جاتے تھے۔ ایسا بالکل نہیں ہوتا تھا کہ پولیس مقتول اور قاتل کے لواحقین کے انتظار میں بیٹھ جائے اور جدھر سے "چائے پانی" زیادہ ملے، تفتیش ادھر کو جھکا دی جائے۔ ہمیں تو اصل مجرم زمین کی تہوں سے نکال کر قانون کے سامنے کھڑے کرنے پڑتے تھے اور اگر استغاثہ کمزور ہو تو پولیس کی خیر نہیں۔

کیس کی جو تفصیل ہمیں مہیا کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ابرار نام کا ایک آدمی جس کی عمر تئیس سال تھی مر گیا۔ موت کا باعث پیٹ کا عارضہ تھا۔ صرف تین دن بیمار رہا اور مر گیا۔ ایک ہندو ڈاکٹر نے علاج کیا تھا۔ اس نے متوفی کے باپ سے کہا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ اسے زہر کا شک تھا۔ ابرار کے باپ کو بھی شک ہوا۔

اس سے پہلے ابرار کو کبھی ایسی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اچانک پیٹ کو کیا ہو گیا تھا؟ باپ اچھی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابرار کی سوشل حیثیت اثر والی تھی۔ باپ نے کمشنر کو درخواست دے دی۔ کمشنر انگریز تھا۔ اس نے پوسٹ مارٹم کا حکم دے دیا۔ پوسٹ مارٹم ہوا تو معدے میں زہر کا اثر نمایاں تھا اور اتنا نمایاں کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں زہر کا نام بھی لکھ دیا گیا۔

تفتیش کے لیے یہ کیس ہمارے پاس آیا اور یہ میرے سپرد کر دیا گیا۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھی۔ مقتول کے علاقے کے تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او کو بلا بھیجا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ میں نے ان لوگوں کی فہرست تیار کی جن سے مجھے تفتیش کرنی تھی۔ ایس۔ ایچ۔ او آیا تو اسے کیس رجسٹر کرنے کو کہا اور وہ دن تفتیش کا خاکہ تیار کرتے اور کاغذی کاروائی پوری کرتے گزر گیا۔ دوسرے دن دفتر گیا اور اس کیس کو سامنے رکھ لیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد انگریز ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ میرے پاس کتنا کام ہے۔ اتفاق سے دوسرے انسپکٹروں کی نسبت میرے پاس کام کم تھا۔ صاحب نے ایک اور کیس میرے حوالے کر دیا۔

اس کیس کی یہ تفصیل دی گئی کہ ایک مسلمان ریٹائرڈ کرنل (جسے آپ کرنل آبدار سمجھ لیں) اپنی کوٹھی کی اندرونی سیڑھیوں سے گر کر مر گیا تھا۔ اس کے لواحقین نے کمشنر کو درخواست دی کہ وہ گیارہ سیڑھیاں ہیں جو چند گز بلند ہیں۔ وہاں سے گر کر کوئی مر نہیں سکتا۔ کرنل کو قتل کیا گیا ہے۔ کرنل کو موت کے روز ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ چوتھے روز ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں لاش قبر سے نکالی گئی اور اس کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا۔ دائیں کنپٹی پر نیلے رنگ کا ابھار تھا جو آنکھ کے قریب سے کان سے دو

اِنچ اوپر تک لمبا تھا۔ لمبائی ساڑھے چار انچ کے قریب تھی۔ یہ شدید ضرب کا نشان تھا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق ایسی ضرب گرنے سے کم ہی لگا کرتی ہے۔ بہرحال قتل کے شک کا جواز موجود تھا۔ اس لیے تفتیش کے لیے یہ کیس بھی مجھے اس حکم کے ساتھ دیا گیا کہ علاقے کے تھانے میں رجسٹر ہوگا اور تھانہ مدد کرے گا ــــ یہ تھانہ شہر کے ایک سرے پر تھا اور مقتول ابرار کا تھانہ دوسرے سرے پر۔ دونوں کے درمیان مشرقی پنجاب کا ایک بہت بڑا شہر تھا جو تقریباً آج کے لاہور جتنا بڑا تھا۔

میں نے دونوں کیس دیکھے تو مجھے یقین ہو گیا کہ دونوں وارداتیں قتل کی ہیں۔ دونوں مقتولین کے لواحقین نے درخواستوں میں ان کی بیویوں پر شک کا اظہار کیا تھا۔ مجھے اپنے ایک ساتھی، انسپکٹر سجن سنگھ کی ایک بات نے بہت دکھ دیا۔ سجن سنگھ میرا بے تکلف دوست تھا۔ ہم ہنسی مذاق میں گالی گلوچ بھی کر لیا کرتے تھے۔ اس نے یہ دونوں کیس دیکھے تو کہا ــــ "مسلمانوں کو دولت اور عورت مل جائے تو وہ اپنے خدا پر بھی قاتلانہ حملہ کرنے سے نہیں ڈرتے۔ تمہارے یہ دونوں کیس دولت اور عورت کا چکر ہے" ــــ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ سمندر پار اور برما میں تو دنیا تباہ و برباد ہو گئی تھی لیکن ہندوستان میں فوجی ٹھیکیداروں اور عہدوں سے لوگوں نے بے پناہ دولت جمع کر لی تھی۔ جنگ نے دوسرا ظلم یہ کیا کہ فوج میں جو جمعدار اور صوبیدار انگریزی لکھ پڑھ لیتے تھے انہیں لیفٹیننٹ اور کپتان بنا دیا اور کئی کرنل کے عہدے تک پہنچے اور ریٹائر ہوئے۔

یہ لوگ دیہاتی تھے اور ان کی بیویاں بھی دیہاتی ــ اور جو شہروں کے رہنے والے تھے، ان کی بھی بیویاں پرانی قسم کی سیدھی سادی عورتیں تھیں مگر میجری اور کرنیلی نے

ان کے دماغ خراب کر دیئے۔ انہوں نے پرانی بیویوں کو طلاقیں دے دیں اور اپنی بیٹیوں کی عمر کی لڑکیوں سے شادیاں کر لیں۔ ان لڑکیوں کے والدین نے عمر کا فرق تو نہ دیکھا، وہ عہدوں اور روپے پیسے پر مرمٹے اور لڑکیوں کو بوڑھے کرنیلوں کے حوالے کر دیا۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو جنگ سے پہلے کہیں کلرک، منشی یا دکان دار تھے۔ جنگ کے دوران ٹھیکیداریاں عام ہوئیں تو جو موقع شناس اور چلتے پرزے تھے وہ ٹھیکیدار اور سپلائر بن گئے اور راتوں رات امیر ہو گئے۔ انہوں نے امیروں کی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

ہم ہندو اور مسلمان میں یہ فرق دیکھا کرتے تھے کہ ہندو کے پاس جائز ناجائز دولت آتی تھی تو وہ صاف ستھرے کپڑے پہننے چھوڑ دیتا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ اس کے پیٹ میں خزانہ ہے۔ وہ اس خزانے کو کاروبار پھیلانے میں صرف کرتا اور مزید دولت کماتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمان کے ہاتھ روپیہ پیسہ آتا تھا تو وہ اس کی نمائش کرتا تھا۔ نئی نویلی دلہن لاتا تھا۔ کوٹھی بناتا اور شراب پیتا تھا۔ مسلمانوں کی اس عادت کی وجہ سے بدکاری عام ہو گئی تھی۔ بوڑھے خاوندوں کی جوان بیویاں من مانی کرتی اور گل کھلاتی تھیں۔ کبھی کبھار کسی کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ جاتی تھی۔ سول کورٹوں میں گھریلو تنازعوں کی بھرمار تھی۔

ان دو کیسوں کا پس منظر بھی مجھے کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا۔ ایک مقتول ریٹائرڈ کرنل تھا جس کی بیوی نوجوان تھی۔ دوسرا مقتول تیس سال کی عمر کا دولت مند ٹھیکیدار تھا۔ یہاں بھی شک اس کی بیوی پر کیا گیا تھا۔ میں نے پہلے اس کیس کی تفتیش شروع کی۔ میں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ کچھ روز دونوں کیسوں کی تحقیقات بیک وقت

شروع کروں گا۔

میں نے مقتول ابرار کے والد اور اُس ڈاکٹر کو بلایا جس نے ابرار کا علاج کیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مقتول ابرار اس کا دوست تھا۔ صحت نہایت اچھی تھی۔ کبھی کبھار کھانسی زکام ہو جاتا تھا۔ پیٹ کا عارضہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک روز اس نے پیٹ میں درد کی شکایت کی۔ دوائی دی مگر درد بڑھ گیا۔ رات کو دوائی بدلی۔ انجکشن دیا۔ اگلے روز درد ذرا کم ہوا مگر مریض کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ پیٹ میں السر کا شک ہوا۔ مگر تیسرے دن کسی سپیشلسٹ کو دکھانے سے پہلے ہی مریض مر گیا۔

"درد معدے کے مقام پر تھا" ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "اگر ناف کے قرب وجوار میں ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ اپنڈے سائٹس اچانک ابھر کر پھٹ گیا ہے۔۔۔۔ میں نے تدفین سے ذرا پہلے لاش کا چہرہ دیکھا تو اس پر مجھے نمایاں نیلاہٹ نظر آئی۔ میں نے میّت کو آخری غسل دینے والوں سے پوچھا کہ منہ سے جھاگ تو نہیں نکلی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ جھاگ نکلی تھی۔۔ پیٹ کے درد سے موت، لاش کا نیلا رنگ اور جھاگ زہر کا ناقابلِ تردید ثبوت تھے۔ میں نے مرنے والے کے باپ سے کہا کہ میّت قبرستان میں جانے سے پہلے ہسپتال جائے گی، پوسٹ مارٹم کے لیے۔ باپ اپنے بیٹے کی چیر پھاڑ سے گھبرایا تو میں نے اسے کہا کہ یہ میرا کیس ہے۔ اگر آپ اسے دفن کر دیں گے۔ تو بھی میں پولیس کو رپورٹ ضرور کروں گا۔ باپ نے ذرا سا سوچا اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"اسے بیوی نے زہر دیا ہوگا"۔۔۔۔ میں فوراً رمیش چندر مجسٹریٹ درجہ اوّل سے ملا۔ وہ میرا دوست ہے۔ اس کی ہدایت اور مدد سے ابرار کے باپ سے درخواست لکھوائی اور کمشنر تک پہنچے جس نے فوری کارروائی کا حکم دیا اور رمیش کو ہی نگران مقرر کر دیا۔

میں بھی ساتھ تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ کے سامنے ہے۔ میرا شک غلط نہیں تھا۔"

میں نے ابرار کے والد سے پوچھا کہ اس نے ابرار کی بیوی پر کس بنا پر شک کیا ہے؟ اس نے جواب دیا ——— "ان میں ناچاقی تھی۔ ابرار نے کئی بار شکایت کی تھی کہ اس کی بیوی اس سے خوش نہیں رہتی۔ مرنے سے کچھ روز پہلے ابرار نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ دوسری شادی کرے تو انہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ میں نے اسے گول مول سا جواب دیا لیکن میں سمجھ گیا کہ ان کی ناچاقی اتنی بڑھ گئی ہے کہ میرے بیٹے نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنی بیوی کو بتایا ہو کہ وہ دوسری شادی کر رہا ہے اور بیوی نے اسے زہر دے دیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیوی کی آشنائی کسی اور سے ہو اور اس نے اپنے آشنا سے مل کر خاوند کو زہر دیا ہو۔"

بہرحال یہ محض شکوک تھے جو میری کوئی مدد نہ کر سکے۔ مزید معلومات یہ ملیں کہ مقتول اپنے والدین سے الگ اپنی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کا باپ اس کے کاروباری حالات سے واقف تھا۔ کسی کے ساتھ اس کی کاروباری دشمنی نہیں تھی۔ ملنسار اور ہنس مکھ تھا۔ شراب کی اسے عادت نہیں تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ یہ شادی اس نے اپنی پسند سے کی تھی۔ بیوی کے والدین قریب کے ایک قصبے میں رہتے تھے۔ ابرار کا ایک دفتر بھی تھا، جس کے دو کمرے تھے۔ ایک سٹاف کے لیے اور دوسرا کمرہ اس کا اپنا تھا۔ میں نے یہ کمرہ بند کر کے تالے کو سربمہر کر دیا۔ سٹاف میں چار آدمی تھے۔ ان سے مقتول کی تعریف اور اس کی موت پر افسوس کے سوا مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جو میرے کام آتی۔

میں مقتول کے گھر گیا۔ اس کی بیوی کو الگ کمرے میں لے گیا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ہم پولیس والے تجربے کی بنا پر چہرے کے تاثرات اور بات کرنے کے انداز سے پہچان لیا کرتے ہیں کہ اس انسان میں جرم کرنے کی صلاحیت یا ہمت ہے بھی یا نہیں جس کا اس پر الزام عائد کیا گیا ہے۔ قتل ایک ایسا جرم ہے جسے عادی قاتل بھی نہیں چھپا سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم عدالت میں اسے قاتل ثابت کر سکتے ہیں یا نہیں ــــ پچیس چھبیس سال کی عمر کی اس لڑکی میں مجھے ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جو جرم کی نشاندہی کرتی۔ اس میں گھبراہٹ ضرور تھی۔ اسے پتہ چل چکا تھا کہ اس کے سسر نے اس پر شک کا اظہار کیا ہے۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا "میرے یہاں آنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ محض شک کی بنا پر آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ میرا فرض یہ ہے کہ شک رفع کروں اور آپ کو بے گناہ ثابت کروں۔ میں آپ کے خلاف نہیں، آپ کے حق میں بھی کام کروں گا۔ آپ میرے سوالوں کا جواب دیتی جائیں"

میں نے تقریباً دو گھنٹے اسے سوالوں کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی۔ اس کا ہر ایک جواب واضح تھا اور اس میں خود اعتمادی تھی۔ اس سے جو کچھ معلوم ہوا وہ مختصراً یہ تھا۔ یہ شادی ابرار کی پسند سے ہوئی تھی۔ اس کے والدین کو پسند نہیں تھی وہ کہیں اور کرنا چاہتے تھے۔ بعد میں اس لڑکی نے انہیں حسنِ سلوک سے خوش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لوگ اس سے ناراض ہی رہتے تھے۔ ابرار میں کوئی بری عادت نہیں تھی۔ پہلے پہل شراب نہیں پیتا تھا۔ دو سال سے پینے لگا تھا ــ پینے کی عادت نہیں تھی۔ گھر میں کبھی شراب نہیں لاتا تھا۔ نہ کبھی گھر میں پی تھی۔ کسی پارٹی میں جاتا تو تھوڑی سی پی لیتا تھا۔

مرنے سے چار، پانچ مہینے پہلے اس کے رویّے میں تبدیلی آگئی تھی۔ بیوی کے ساتھ پہلے والی بے تکلفی نہ رہی کبھی کبھی رات کو دیر سے آتا۔ بیوی پوچھتی تو بے رخی سے ٹال دیتا۔ بیوی کو شک ہوا کہ اس کی توجہ کسی اور کی طرف ہو گئی ہے۔ گھر میں لڑائی جھگڑوں کے متعلق اس نے بتایا کہ لڑائی یا جھگڑا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ چند مرتبہ بیوی نے ترش کلامی اور غصے میں گلے اور شکایتیں کی تھیں۔ یہ تو بیوی کو بالکل ہی علم نہیں تھا کہ وہ رات دیر سے آتا ہے تو رہتا کہاں ہے۔

"ابرار نے جب آپ کو بتایا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ کا ردِ عمل کیا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"دوسری شادی؟" اس نے حیران ہو کر کہا ــــ "ابرار نے کبھی ایسی بات نہیں کہی تھی، نہ ہی میں نے کبھی سوچا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا... آپ نے کیسے کہہ دیا ہے کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا"

"ہمیں سب کچھ پتہ ہوتا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔ ابرار کو زہر دیا گیا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ زہر آپ نے دیا ہو آپ ذہن پر زور دے کر سوچیں کہ ابرار کے دوستوں میں اور ملنے جلنے والوں میں ایسا کون ہو سکتا ہے جس نے اسے زہر دیا ہو"

اس کے دانت پسنے لگے اور اس کی مٹھیاں اس طرح بند ہو گئیں جیسے وہ مجھے گھونسہ مار کر دانت توڑ دے گی۔ میں اس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔

"کیا یہ واقعی ثابت ہو گیا ہے کہ ابرار زہر سے مرا ہے؟ میں تو یہ سمجھی تھی کہ اس کا ابا میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا چاہتا ہے تاکہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں اور

وہ اس کوٹھی پر قبضہ کرے۔ یہ ذرا لوگوں سے پوچھیں کہ جب ابرار کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد چیری پھاڑی ہوئی میرے پاس آئی تھی تو میرا کیا حشر ہوا تھا اور میں نے کیا داہی تباہی بکی تھی۔ ابرار کو سر درد ہوتا تھا تو میں ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ وہ مر گیا تو باپ نے اس کا پیٹ چاک کروا دیا۔ یہ اس کا باپ بدطینت اور کمینہ پرور انسان ہے ... لیکن انسپکٹر صاحب آپ کو یقین ہے کہ ابرار کو زہر دیا گیا تھا؟"

"پوسٹ مارٹم میں یہی لکھا ہے"۔۔۔ میں نے جواب دیا۔

اس نے دانت پیس کر کہا۔۔۔ "مجھے پتہ چل جائے کہ ابرار کو زہر کس نے دیا تھا تو اسے پھانسی نہ چڑھنے دوں۔ ان ناخنوں سے اس کی گردن چیر کر اس کا خون پی جاؤں گی"۔ اس کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس نے ہذیانی باتیں شروع کر دیں اور اس نے یہ بھی کہا۔۔۔ "میرے بھائی اس آدمی کا قیمہ کر کے سڑک پر پھینک دیں ... ہائے ابرار تو کبھی مجھے تو بتاتا کہ کون ویری تیرے پیچھے لگا ہوا ہے"۔

مجرم ایکٹنگ کیا کرتے ہیں مگر وہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ ایک باعزت گھرانے کی جوان عورت کامیاب ایکٹنگ نہیں کر سکتی۔ میں نے اس عورت کو ذہن سے اتارا نہیں۔ البتہ اس پر شک بے بنیاد تھا۔ اب میرے سامنے دو سوال تھے۔۔۔ ایک یہ کہ ابرار نے خودکشی کی ہے؟ دوسرا یہ کہ خودکشی نہیں کی تو اس کے کس دشمن نے اسے زہر دیا ہے؟۔۔۔ خودکشی بعید از قیاس تھی۔ اس کی بیوی کے کہنے کے مطابق اسے کوئی مالی پریشانی نہیں تھی اور نہ ہی گھر میں کوئی ایسا سنگین مسئلہ تھا کہ وہ خودکشی کر لیتا۔ زہر دینے کی ایک وجہ انشورنس بھی ہو سکتی تھی۔ ہمارے ملک میں جب سے انشورنس رائج ہوئی ہے، کبھی کسی کی بیوی اور

کبھی کسی کے خاوند کی اچانک موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کیس میں بھی انشورنس کا دخل ہو سکتا تھا لیکن میں نے دانستہ ابرار کی بیوی سے خاوند کی انشورنس کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ میں اسے چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ میں انشورنس کے متعلق کچھ جانتا ہی نہیں۔

میں نے مقتول کے دفتر کا کمرہ سر بمہر کر دیا تھا۔ اس کے گھر سے رخصت ہونے سے پہلے اس کی بیوی سے پوچھا ”مرحوم اپنے ذاتی اور ضروری کاغذات کہاں رکھتے تھے؟“ — بیوی نے کہا ”آئیے، میں آپ کو ان کی ذاتی میز اور بریف کیس دکھا دیتی ہوں ... آپ چاہیں تو سارے گھر کی تلاشی لے لیں۔ خدا کے لیے مجھے جلدی بتائیں کہ ابرار کو زہر کس نے دیا ہے؟“ — میں نے اس کی میز کی درازیں دیکھیں، بریف کیس دیکھا، اس کا اٹیچی کیس دیکھا۔ وہاں کوئی اہم کاغذ نہ تھا۔ اس کی بیوی نے کہا ”ان کے تمام ضروری کاغذات دفتر میں ہوتے ہیں“

جاتے جاتے میں گھر کی نوکرانی اور نوکر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے دفتر میں انہیں ڈرایا دھمکایا اور یہ بھی کہا کہ تمہاری بیگم یہ کوٹھی چھوڑ کر جا رہی ہے۔ تمہاری نوکری تو چھوٹ ہی جائے گی، پھر ڈر کیسا؟ مگر انہوں نے میاں بیوی کی تعریف کی۔ بیوی کے متعلق بتایا کہ بڑی شریف عورت ہے۔ خاوند کی غیر حاضری میں کوئی غیر مرد گھر میں نہیں آیا۔ بیوی خاوند کے ساتھ کبھی کسی پارٹی میں نہیں گئی۔

کرنل سیڑھیوں سے گرا تھا

تفتیش کا یہ ابتدائی مرحلہ تھا۔ میں نے سی۔ آئی۔ ڈی کے چار آدمیوں کو خفیہ

طریقۂ کار سے تحقیقات پر لگا دیا۔ وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ میں دوسرے کیس کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ کرنل آبدار کی موت کی تحقیقات تھی۔ اس کے گھر گیا۔ بڑی خوبصورت کوٹھی تھی۔ اس کی بیوی سے ملا۔ وہ ابرار کی بیوی سے بہت مختلف تھی۔ تھی آدابرار کی بیوی بھی خوبصورت لیکن کرنل کی بیوی کی خوبصورتی میں کوئی اور ہی بات تھی۔ اس کی ڈیل ڈول، چلنے اور بولنے کا انداز بتاتا تھا کہ لڑکی شریف نہیں۔ عمر ابرار کی بیوی جتنی تھی جب کہ کرنل کی عمر موت کے وقت بچپن سال بتائی گئی۔ میاں بیوی میں پورے تیس سال کا فرق تھا۔ اگر یہاں کوئی جرم ہوا تھا تو وہ عمر کے اسی فرق کی پیداوار تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر ہی مجھے یقین ہو گیا کہ اس کوٹھی میں کوئی ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔

میں لڑکی کو بتانے لگا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں، ہاں، میں جانتی ہوں آپ کیوں تشریف لائے ہیں۔ کرنل صاحب سیڑھیوں سے نہیں گرے۔ ان کے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ کرنل صاحب کو قتل کیا گیا ہے۔ انتقام لینے کا یہ موقع ان کے لیے بہت اچھا تھا" ——— وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی ——— "میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو بتاؤں وہ کہاں سے گرے تھے۔"

وہ مجھے ڈرائنگ روم سے باہر لے گئی۔ ساتھ ہی ڈیوڑھی کی طرح ایک فراخ کمرہ تھا۔ اس میں نہایت خوبصورت سیڑھیاں اترتی تھیں۔ تعداد گیارہ تھی۔ ہر ایک سیڑھی تقریباً آٹھ انچ اونچی تھی اور اس پر ماربل چپس تھے۔ دونوں طرف ہر سیڑھی سے ایک چمکیلی گول پائپ اوپر کو نکلی ہوئی تھی اور ان پائپوں پر گول لکڑی نیچے سے اوپر تک چلی گئی تھی۔ یہ دراصل سیڑھیوں کا ایک دلکش سیٹ تھا جسے آپ زینہ کہہ

سکتے ہیں۔ اوپر سونے کا کمرہ اور تین مزید کمرے تھے۔ اس بلندی اور ان سیڑھیوں سے گر کر مرنا قابلِ یقین نہیں لگتا تھا۔

"کرنل صاحب اوپر والی سیڑھی سے پھسلے اور نیچے آ رہے۔" کرنل کی بیوی نے اپنے آپ سنانا شروع کر دیا۔ "وہ ناشتے کے لیے آ رہے تھے۔ میں پیچھے تھی۔ وہ فرش پر لڑھکتے ہوئے آئے۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہیں سکے۔ میں نے نوکروں کو بلایا۔ کرنل صاحب کو اٹھا کر پلنگ پر ڈلوایا اور ڈاکٹر ملہوترا کو بلایا۔ ان کے آنے تک صاحب مر چکے تھے۔ آپ نوکروں سے پوچھیں۔ ڈاکٹر ملہوترا سے پوچھیں۔"

"محترمہ!" میں نے اسے چپ کرانے کے لیے کہا۔ "میں آپ سے بہتر سمجھتا ہوں کہ مجھے کس سے پوچھنا ہے۔ اب ذرا مجھے بولنے کا موقعہ دیں ...... کرنل صاحب کے پاؤں میں کیا تھا؟"

"سلیپر تھے۔" اس نے کہا "وہ ابھی سلیپنگ سوٹ پہن تھے۔"

"مجھے وہ سلیپر دکھا دیجئے۔" میں نے کہا اور اس کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے کہا۔ "میرے ساتھ تعاون کیجئے۔ مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ کرنل صاحب کی موت کی ذمہ دار آپ نہیں۔"

وہ سلیپر لانے کو چلی تو میں بھی ساتھ چل پڑا۔ اس نے کہا۔ "آپ کے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں، میں سلیپر لے آتی ہوں۔" لیکن میں ساتھ چلا گیا۔ کرنل صاحب کے جوتوں میں سے سلیپر اٹھائے۔ ان کے تلوے دیکھے۔ ان پر مجھے کوئی چکناہٹ نظر نہ آئی۔ میں نے سلیپر قبضے میں لے لیے۔

کرنل کی ازدواجی زندگی کی تفصیلات یہ تھیں۔ سپلائی کور میں جمعدار تھے۔ جنگ

شروع ہوتے ہی انہیں کمشن دے کر لیفٹیننٹ بنا دیا گیا۔ چھ مہینے بعد کپتان ہو گئے۔ دو سال بعد میجر ہوئے۔ میجر ہوتے ہی پہلی بیوی کو طلاق دے دی کیونکہ وہ پرانے ماڈل کی بیوی تھی۔ کرنل صاحب چونکہ سپلائی کور میں تھے۔ اس لیے یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سرکار کا مال بیچا اور اپنا گھر بھرا تھا۔ یہ ان کی کوٹھی اور فرنیچر وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ مہاراجوں اور نوابوں کی سی شان تھی۔ جنگ کے آخری سال کرنل بن گئے اور اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ شادی لڑکی کے ماں باپ کی مرضی سے ہوئی تھی۔

میں نے لڑکی سے پوچھا کہ اپنے سے تیس سال بڑے آدمی کے ساتھ جس کی پہلے ہی ایک بیوی اور پانچ بچے تھے شادی کر کے وہ کیا محسوس کرتی تھی؟ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی شوخی اور زبان کی تیزی ختم ہو گئی۔ میں نے اسے جذباتی سہارا دینے کے لیے کہا —— "ہماری سوسائٹی کا یہ حادثہ کتنا افسوسناک ہے کہ ایک نوجوان لڑکی کو ایک بوڑھے کے ساتھ بیاہ دیا گیا اور لڑکی نوجوانی میں بیوہ بھی ہو گئی" —— اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا —— "آپ کے ساتھ ظالمانہ جبر کیا گیا تھا" —— اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے آنسو پونچھے اور آہ لے کر کہا —— "اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں میں نے قتل کیا یا کروایا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے گرے اور مر گئے"

میں نے سوال شروع کر دیئے۔ میرے سوالوں کے جال سے وہ صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کے خانساماں اور نوکروں سے میں نے جو معلومات حاصل کیں، وہ یہ تھیں کہ جب بیگم نے شور مچایا تو وہ اندر گئے۔ کرنل صاحب سیڑھیوں کے نیچے

فرش پر پڑے تھے۔ وہاں باہر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ گھر میں کئی لوگ آیا کرتے تھے۔ بیگم سے الگ تھلگ ملنے کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔ بیگم اکثر اکیلی باہر جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات کرنل صاحب گھر پر ہوتے تھے اور بیگم باہر گئی ہوئی ہوتی تھی۔ ان کا کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔۔۔ ایک نوکر نے بتایا کہ آخری رات ایک آدمی کرنل صاحب کے ساتھ الگ کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔ دونوں بہت دیر تک وہسکی پیتے رہے تھے۔ بیگم اوپر چلی گئی تھی۔

"تم اس آدمی کو پہچان سکتے ہو؟" ۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بڑی اچھی طرح" ۔۔۔ نوکر نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ پہلے بھی دو تین بار آیا تھا۔ نام معلوم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں رہتا اور کیا کرتا ہے۔"

میں نے کرنل کی نوجوان بیوہ کو تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں۔ میں اس کی حفاظت کروں گا اور اس طرح کے کچھ جھوٹے وعدے اور جھوٹی ہمدردی کر کے اس کے دل سے یہ شک نکال دیا کہ میں اسے مجرم سمجھتا ہوں ۔۔۔ میں وہاں سے رخصت ہوا۔ میرے ذہن پر یہ معمہ سوار تھا کہ بیگم اور نوکروں کے کہنے کے مطابق کرنل کو فرش سے اٹھایا گیا تھا اور بیگم کے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا۔ تو کیا کرنل کو اگر قتل ہی کیا گیا ہے تو بیگم نے کیا ہے؟ یا بیگم نے اسے کسی آدمی سے جو کوئی نوکر ہی ہو سکتا ہے، قتل کروایا ہے؟ مگر نوکروں نے علیحدگی میں مجھے ایک دوسرے کے متعلق بتایا تھا کہ اُس وقت کوئی نوکر اندر نہیں تھا تو کیا تمام نوکر جن کی تعداد تین تھی، قتل میں شامل ہیں؟

میں ڈاکٹر ملہوترا سے ملا۔ اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ دکھائی۔ ڈاکٹر ملہوترا کو ہی

کرنل کی بیوی نے بلایا تھا۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا "کرنل پنشن پر آنے کے بعد میرا مریض رہا۔ شراب نے اس کے اندر کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اس نے اپنے آپ کو نفسیاتی مریض بنا لیا تھا۔ مجھ سے اکثر طاقت کے انجکشن لیا کرتا تھا۔ وہ مصنوعی طریقوں سے جوان ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ بوڑھے جسم میں طاقت کی دوائیاں ڈال ڈال کر اس نے اپنا دل کمزور کر لیا تھا۔ اس میں شراب کا اثر بھی شامل تھا۔ وہ جب سیڑھیوں سے گر کر مرا تو میں بالکل حیران نہیں ہوا۔ گرنے کی چوٹ مہلک نہیں تھی، مہلک گرنے کا احساس اور صدمہ تھا، جس سے اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کنپٹی کی جس چوٹ کا ذکر ہے وہ لاش پر موجود تھی لیکن اتنی نمایاں نہیں تھی۔ میں اسے گرنے کی چوٹ سمجھا تھا"

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے اسے کہا "ذرا سیڑھیوں کو تصور میں لائیں یا میرے ساتھ چل کر ایک نظر اس خوبصورت زینے کو دیکھ لیں۔ کیا وہاں سے گرنے اور لڑھکتے ہوئے نیچے آنے سے کنپٹی پر اتنی شدید چوٹ آ سکتی ہے کہ وہاں خون جمع ہو جائے؟ میں نے جنگلے کی لکڑی دیکھی ہے۔ وہ گول اور تقریباً پانچ انچ موٹی ہے۔ اگر کرنل کا سر اس لکڑی سے ٹکراتا تو چوٹ اس طرح کی نہیں ہو سکتی تھی جیسی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھی گئی ہے۔ یہ چوٹ ڈنڈے کی لکھی گئی ہے"

"میں نے اس چوٹ کا نشان دیکھا اور اس پر غور بھی کیا تھا" ڈاکٹر نے کہا۔ "اب آپ کی باتوں سے میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ یہ چوٹ نہ تو زینے کے جنگلے کی لکڑی کی ہے نہ ہی سیڑھیوں کے کناروں کی۔ چوٹ مشکوک ہے"

جرم و جاسوسی کا شوق

میرے لیے کیس تو ابرار کا بھی اہم تھا لیکن کرنل کا کیس زیادہ توجہ طلب تھا۔ اس کی بیوی میری نگاہ میں مشتبہ تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس کیس کی بنیاد پکی کروں۔ کہیں لڑکی اپنی بنیاد پکی نہ کرلے۔ میں دوسرے دن پھر اس کے گھر گیا۔ ڈرائنگ روم میں اس کے کچھ ملنے والے بیٹھے تھے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ ان سے فارغ ہولے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ یہ اس کا کوئی خاص کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک خوبصورت ریک میں تین چار رسالے اور کتابیں پڑی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہ رسالے اور کتابیں یہ لڑکی پڑھتی ہے تو ان سے اس کی ذہنی سطح کا پتہ چل جائے گا۔ میں نے اردو کی کتابیں دیکھیں۔ یہ ناول تھے۔ ورق گردانی کی اور کہیں کہیں سے دو چار فقرے پڑھے۔ ہر ناول عریاں اور فحش تھا۔ ایک انگریزی رسالہ دیکھا۔ یہ تو نیم عریاں تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ ہر تصویر میں جنسی اشتعال کا پورا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔

پھر انگریزی کی ایک کتاب اٹھائی۔ یہ جرم و جاسوسی کی کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ کتاب کھولی تو ایک صفحے کا کونہ موڑ کر نشان کیا ہوا تھا، جیسے پڑھنے والے نے کہانی یہاں تک پڑھی ہو۔ میں نے اس صفحے کو دیکھا۔ ایک پیراگراف کے ساتھ حاشیے میں پنسل کی ہلکی سی لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ اس لکیر کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے کو یہ پیراگراف زیادہ پسند آیا ہے۔ میں نے یہ پیراگراف پڑھا تو مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں بڑی ہی پیچ در پیچ بھول بھلیوں سے نکل آیا ہوں

اور خدا کے ہاتھ نے مجھے سیدھی راہ پر ڈال دیا ہے۔ لڑکی ابھی اپنے مہمانوں سے فارغ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یہ ساری کہانی پڑھ لی اور کتاب ریک میں اسی جگہ رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔

نصف گھنٹہ بعد لڑکی آ گئی۔ میں نے دو چار بے تکلفی کی باتیں کر کے ان کتابوں کے متعلق پوچھا اور ان کی تعریف بھی کی۔ اس نے بتایا کہ اسے جرم و جاسوسی کی کہانیاں زیادہ پسند آتی ہیں۔ اس نے وہی انگریزی کی کتاب اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دی اور کہنے لگی — "ایسی کتابیں آپ بھی پڑھا کریں۔ آپ کو ڈیٹیکشن (سراغرسانی) میں بہت مدد ملے گی۔ اس کتاب کی ہر کہانی ایسی ہے کہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ قتل کس طرح کیا گیا ہے مگر قاتل پکڑا نہیں جاتا کیونکہ ثبوت مہیا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کتاب کا ٹائیٹل دیکھا اور کتاب اس طرح ریک میں رکھ دی جیسے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو معلوم نہیں کہ مجرم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت مضبوط ہو۔ یہ لڑکی ایک بھیانک جرم کر کے اس کا ثبوت اپنے ہاتھوں میرے سامنے رکھ رہی تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کتاب جس میں کوئی قاتل پکڑا نہیں جاتا، مجھے اس لڑکی کو گرفتار کرنے کا جواز مہیا کر چکی ہے۔ پنسل کی ایک باریک سی لکیر نے اس کی قسمت کی لکیروں کو بدل دیا تھا۔

میں نے اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور اس کے نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس عورت کو بلایا جو گھر میں جھاڑو اور صفائی کرتی تھی۔ مجھے کتاب کے الفاظ نے اس عورت سے کچھ پوچھنے کی راہنمائی کی تھی۔ میں نے اسے پہلے تو تھوڑا سا ڈرایا پھر پوچھا کہ جس روز کرنل صاحب سیڑھیوں کے اوپر کمرے میں سے

گر سے تھے اس روز اس نے سیڑھیوں کی صفائی کی تھی؟ اس نے کہا — "وہ تو میں ہر روز کرتی ہوں۔ ساری کوٹھی کی جھاڑ پونچھ میرے ذمے ہے۔"

"ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ جب تم نے سیڑھیاں صاف کی تھیں تو وہاں کیلے کا یا کسی فروٹ کا چھلکا تو نہیں تھا؟" میں نے اس سے پوچھا — "یا کوئی چکنی چیز؟"

"بیگم صاحب نے مجھے کہا تھا کہ سیڑھیاں اچھی طرح دھو دینا۔" اس نے کہا۔ "سچی بات ہے جی! اُدھر کرنل صاحب کی میت پڑی تھی، اِدھر بیگم کو گھر کی صفائی کی پڑی ہوئی تھی۔ ایسے وقت کون جھاڑو دیتا ہے لیکن بادشاہوں کے دستور نرالے ہوتے ہیں جی۔"

"تم نے سیڑھیاں دھوئی تھیں؟"

"حکم مانا جی!" اس نے کہا۔

"کوئی خاص چیز تم نے دیکھی؟ کیا سیڑھیاں زیادہ گندی تھیں؟"

"گندی تو نہیں تھیں۔" اس نے کہا — "میں نے اوپر کی سیڑھی پہ پانی میں بھگویا ہوا کپڑا پھیرا تو وہاں جھاگ پیدا ہو گئی۔ اس سے نیچے والی سیڑھی پر بھی ایسی ہی جھاگ پیدا ہوئی تھی۔ میں نے دل میں نوکروں کو گالیاں دیں کہ انہوں نے یہاں صابن گرا دیا تھا۔"

"تم نے کبھی یہ سیڑھیاں صابن سے دھوئی تھیں؟"

"کبھی بھی نہیں۔ مگر اس روز میرے گیلے کپڑے سے وہاں جھاگ اٹھی تو میں نے سوچا کہ یہ تو صابن کی جھاگ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے پھر زیادہ توجہ نہیں دی کیونکہ گھر میں کرنل صاحب کی میت پڑی تھی۔ مجھے ان کے مرنے کا بہت افسوس تھا

اگر یہ کیس تھانے والوں کے سپرد ہوتا تو انہیں بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہمارے محکمے کے اختیارات لامحدود تھے۔ ہم بڑے سے بڑے افسر کو بھی پابند کر سکتے تھے۔ میں نے کرنل کی بیگم سے کہا کہ وہ سونے والے کمرے میں چلی جائے۔ اس نے میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ میں نے اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور اس کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آیا۔ مگر میری ذہنی کیفیت بدل چکی تھی جو وہ بھانپ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں میں خمار کا بڑا ہی دلنشیں تاثر پیدا کر کے بولی —— "آئیں ناں آپ بھی میرے سونے کے کمرے میں، وہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

یقین کیجیے کہ اس کی یہ پیش کش ٹھکرانے کے لیے مجھے اپنے آپ پر بڑا ہی جبر کرنا پڑا۔ وہ اپنا آپ مجھے رشوت کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ اس کی یہ پیش کش اس کے جرم کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں نے اپنے اوپر قابو پا لیا اور اسے کہا۔ "آپ سونے کے کمرے میں چلی جائیں۔ اب آپ کسی سے نہیں مل سکیں گی۔ آپ کے نوکر آپ کے پاس آئیں تو ان کے ساتھ ایک پولیس کانسٹیبل ہو گا۔" —— وہ سخت گھبرائی اور میرے کئی بار کہنے پر وہ اوپر چلی گئی۔

میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو کرنل کے گھر سے ہی ٹیلیفون کیا اور کہا کہ چار باوردی کانسٹیبل میرے پاس آجائیں۔ رائفلوں سے مسلح ہوں۔ فون بند کر کے میں لڑکی کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے کہا —— "وہ ڈنڈا کہاں ہے؟" —— اس نے حیران ہو کر پوچھا —— "کون سا ڈنڈا؟"

"جس سے آپ نے یا آپ کے کسی دوست نے کرنل کو قتل کیا ہے۔"
وہ تو چکرا کر گرنے لگی تھی۔ میں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور کہا ___ "ہو سکتا ہے کتاب میں چھپی ہوئی کہانیوں کے قاتل نہ پکڑے گئے ہوں لیکن کتابوں سے طریقے پڑھ کر جرم کرنے والے جلدی پکڑے جاتے ہیں۔ دیکھئے محترمہ!" میں نے رعب سے کہا ___ "اگر آپ پریشانی اور اذیت سے بچنا چاہتی ہیں تو مجھے صاف بتا دیں کہ اوپر کی آخری اور اس سے نیچے کی سیڑھی پر صابن کس نے ملا تھا اور جب کرنل پھسل کر نیچے آیا تو اس کی کنپٹی پر ڈنڈا کس نے مارا تھا؟" ___ اس کے ہونٹ کانپنے لگے، اور اس کی آنکھیں ڈر سے اور حیرت سے کھل گئیں۔ وہ عادی مجرم تو نہیں تھی، نوجوان لڑکی تھی جس کا تعلق امیر کبیر گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے خاوند کو کسی جوان آشنا کی خاطر یا خاوند کی انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے جو ایک لاکھ روپیہ تھی، قتل کرا چکی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ قتل ہضم کر جانا کسی نوجوان لڑکی کے بس کی بات نہیں۔ میں نے اسے کہا ___ "میں آپ کو قتل کی سزا سے بچا سکتا ہوں۔ آپ ان آدمیوں کو پکڑوا دیں جو آپ کے ساتھ اس جرم میں شامل تھے۔ میں آپ کو وعدہ معاف گواہ بنا دوں گا۔"

اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کو سوچنے کا بہت وقت دوں گا۔ آپ اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکیں گی۔ ابھی پولیس کے سپاہی آ جائیں گے۔ وہ آپ کی ساری ضروریات پوری کریں گے۔ اب آپ الزام سے انکار کرنے اور بچنے کی نہ سوچیں بلکہ جو میں نے کہا ہے وہ سوچیں، آپ کی نجات اسی میں ہے۔"

میں اسے سخت پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ نوکروں کو ہدایت دی کہ وہ کوٹھی کے اندر صرف اس صورت میں جائیں جب ان کے ساتھ ایک کانسٹیبل ہو۔ انہیں کسی سے ملنے سے روک دیا۔ کچھ دیر بعد چار مسلح کانسٹیبل آ گئے۔ انہیں اپنے حوالدار کی نگرانی میں ضروری ہدایات دے کر میں دفتر چلا گیا۔ میں اب اس چکر میں پڑا ہوا تھا، کہ اس لڑکی کے خلاف شبہہ تو پختہ ہو گیا ہے مگر ثبوت اور شہادت کیا ہے جس کی بنا پر اسے گرفتار کروں اور کیس تیار کروں۔ اب میری امید کا انحصار کرنل کی نوجوان بیگم کے اعصاب پر تھا کہ وہ کتنی دیر تک قائم رہتے اور کب ٹوٹتے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ اس کی برداشت جلدی ختم ہو جائے گی اور وہ اقبال جرم کر کے مجھے اپنے ساتھی اور ثبوت دے دے گی۔

اس کی تصویر اور زہر کی بوتل

میں نے دفتر میں جا کر یہ کارگزاری لکھی اور اگلا پروگرام نوٹ کیا۔ یہ فیصلہ کر کے کہ اس لڑکی کو کل شام تک سوچنے کی مہلت دوں اور اتنی دیر میں ابرار کے کیس کی تفتیش کچھ آگے بڑھاؤں۔ وہاں سی۔آئی۔ڈی کے جو آدمی چھوڑے تھے ان سے کوئی کارآمد سراغ نہ ملا۔ ابرار کے ذاتی کاغذات دیکھنا لازمی تھا۔ اس کیس کا سراغ کاغذوں سے مل سکتا تھا۔ اس کی بیوی دھلی ہوئی سلیٹ کی مانند تھی۔ میں نے دو مشیروں کو ساتھ لیا۔ کسی چیز کی برآمدگی کی گواہی دینے کے لیے دو ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جن کا پولیس اور ملزم کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ انہیں مشیر کہا جاتا ہے جو برآمدگی کے مشیر نامے پر دستخط کرتے ہیں۔ میں نے دو معزز آدمی ساتھ لیے

اور ابرار کے دفتر گیا۔ سٹاف کے دو آدمی موجود تھے۔ میں نے ابرار کے کمرے کے تالے کی مہر توڑی۔ تالا کھولا اور اندر گیا۔ اس کی میز کی ایک دراز سے چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا۔ ان سے اس کی میز کا ایک مقفل دراز کھولا۔ اس میں سے ایک خوبصورت فائل کور نکلا۔ اسے کھولا تو اس میں سے ایک تصویر نکلی۔ یہ ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ بال ماتھے پر پڑے ہوئے۔ مسکراہٹ میں بے حیائی اور حسن میں بے پناہ دل کشی ——— یہ تصویر کرنل آبدار کی نوجوان بیوہ کی تھی۔

میں نے فائل کور میں رکھے ہوئے کاغذات کو دیکھا۔ اس لڑکی کا کوئی خط برآمد نہ ہوا البتہ ایک اور تصویر نکلی، یہ ابرار اور اسی لڑکی کی تھی۔ دوسری طرف اُس فوٹوگرافر کی دکان کی مہر تھی جہاں یہ تصویر لی گئی تھی۔ باقی کاغذات میں سے کوئی انشورنس کی پالیسی نہ نکلی۔ الماری سے بھی کوئی کارآمد کاغذ برآمد نہ ہوا۔ میں نے تصویروں کی برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا اور دونوں مشیروں سے دستخط کرائے۔ ابرار کے دفتر کے جو آدمی وہاں موجود تھے، انہیں لڑکی کی تصویر دکھا کر پوچھا کہ یہ لڑکی کبھی دفتر آئی تھی یا نہیں ۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکی چار پانچ مرتبہ شام کو یہاں آئی تھی، ابرار صاحب اس کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

دوسرے آدمی نے بتایا ——— "ابرار صاحب کی وفات سے ایک روز پہلے اس لڑکی کا فون آیا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ ابرار صاحب بیمار ہیں۔ آج دفتر نہیں آسکیں گے۔ دوسرے دن بھی اس کا فون آیا۔ اگلے روز ابرار صاحب فوت ہو گئے ——— دو روز دفتر بند رہا۔ جس روز دفتر کھلا تو اس لڑکی کا فون آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابرار صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ وہ مان نہیں رہی تھی۔ آخر اس کے منہ سے اس

طرح کے الفاظ نکلے۔ "ہائے اللہ، میں بالکل ہی لُٹ گئی۔ پھر اس طرح آواز آئی جیسے اس نے ریسیور رکھا نہیں بلکہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا"

میں نے ان دونوں کو گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔

یہ تھا ایک بہت بڑے شہر کی سوسائٹی کا ڈرامہ۔ ایک قتل ایک سرے پر ہوا، دوسرا دوسرے پر اور دونوں ایک دوسرے سے متعلق تھے۔ ابرار کی بیوہ کے اس سوال کا جواب مل گیا تھا کہ ابرار راتوں کو باہر جو رہتا ہے تو کہاں جاتا ہے۔ یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ کرنل کے قتل میں ابرار کا ہاتھ تھا مگر یہ معمہ ابھی حل طلب تھا کہ ابرار کو زہر کس نے دیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ابرار کرنل کے مرنے سے تیسرے روز مرا تھا۔ کیا کرنل کی بیوہ کے کسی چاہنے والے نے ابرار کو زہر سے راستے سے ہٹایا ہے؟ اور کیا کرنل کے سر پہ ڈنڈا مارنے والا بھی یہی شخص تھا جس نے ابرار کو زہر دیا ہے؟—

میں اب اندھیرے میں ٹٹول رہا تھا۔ ذہن میں یہ خیال آیا کہ کرنل کے ایک نوکر نے بتایا تھا کہ آخری رات ایک آدمی کرنل کے پاس بیٹھا وہسکی پیتا رہا تھا۔ میں نے اسی کو تنکے کا سہارا سمجھا اور کرنل کی کوٹھی گیا۔ اس نوکر کو ابرار کی تصویر دکھائی جس کے ساتھ کرنل کی بیوی کی تصویر تھی۔ اس بوڑھے سے نوکر نے ذرا غور سے دیکھ کر کہا— "یہی آدمی تھا جو آخری رات کرنل کے ساتھ بیٹھا رہا تھا"

"اس آدمی کے متعلق تم کچھ اور بھی جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور بھکاریوں کی طرح التجا کی — "حضور والا! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرے دل میں ایک راز ہے۔ اگر بتا دوں تو میرا کوئی نقصان تو نہیں ہو گا؟"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ راز کیا ہے۔" میں نے کہا ـــ "اگر تُو نے میری مشکل حل کر دی تو انعام دوں گا۔"

وہ مجھے اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ بیوی بچوں کو باہر نکال دیا۔ مجھے چارپائی پر بٹھا کر اس نے ایک ٹرنک سا کے اوپر سے دوسرا ٹرنک اٹھا کر پرے رکھا۔ نیچے والے ٹرنک کو کھول کر اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر سوڈا واٹر کی ایک بوتل نکالی۔ اس میں پانی سا تھا جس کا رنگ کچھ سبز تھا اور اوپر جھاگ تھی۔ بوتل کے منہ میں کارک تھا۔ یہ اسی شہر کی ایک بیوریج کمپنی کی بوتل تھی۔ اس نے بوتل میرے ہاتھ میں دے دی اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے غصے سے کہا ـــ "اب کچھ منہ سے بھی بکو... یہ کیا ہے؟"

"حضور والا! اس میں زہر ہے۔" اس نے کہا ـــ "مجھے شک ہے کہ اس زہر سے اس آدمی کو مارا گیا ہے جس کی آپ نے مجھے تصویر دکھائی ہے۔ ان کا نام ابرار ہے۔"

"تم اس آدمی کو کس طرح جانتے ہو؟"

کرنل کی بیگم اور بلّی

"عالی جاہ! میں بیگم صاحب کا خاص ملازم ہوں۔ یہ شخص بیگم صاحب کا دوست تھا۔ اس کے مرنے کا مجھے اس طرح پتہ چلا کہ ایک روز بیگم صاحب نے مجھے اس کے دفتر میں بھیجا اور کہا کہ مجھے ٹیلیفون پر کسی نے بتایا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا تم جا کر پتہ کرو... میں اس کے دفتر گیا تو پتہ چلا کہ وہ واقعی مر گیا ہے۔ اس بوتل کا قصہ یہ ہے کہ آخری رات کرنل صاحب نے مجھے بلایا۔

بس گیا تو یہ آدمی ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کرنل صاحب نے مجھے وہسکی کی بوتل اور گلاس وغیرہ لانے کو کہا۔ میں نے یہ چیزیں ان کے آگے رکھ دیں اور برآمدے میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں سوڈے کی دو بوتلیں بھی فریج سے نکال کر ان کے آگے رکھ آیا تھا۔۔

وہسکی پلانا میرے فرائض میں شامل تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں یہ دیکھنے کے لیے اندر جانے لگا کہ کچھ اور ضرورت نہ ہو۔ میں کمرے میں گیا تو کرنل صاحب وہاں نہیں تھے۔ یہ آدمی (ابرار) اکیلا بیٹھا تھا۔ مجھے کہنے لگا ——— "تم کہاں تھے۔ دیکھو کرنل صاحب خود سوڈا لینے گئے ہیں" ——— میں دوڑتا پینٹری میں گیا تو دیکھا کہ کرنل صاحب سوڈے کی ایک بوتل کھول کر کھڑے اسے دیکھ رہے تھے اور بوتل ہلا بھی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر گھبرا گئے اور ایک کاغذ کو مٹھی میں دبا کر بولے ——— "تم بے شک چلے جاؤ۔ ہم کچھ دیر بیٹھیں گے" ——— میں برآمدے میں چلا گیا۔ میں نے بالکل نہیں سوچا کہ کرنل صاحب بوتل میں کیا دیکھ رہے تھے اور انہوں نے کاغذ کا جو پرزہ مٹھی میں دبا لیا تھا، وہ کیا تھا؟۔۔۔۔

"بے شک کرنل صاحب نے مجھے کہہ دیا تھا کہ تم چلے جاؤ۔ لیکن میں برآمدے میں موجود رہا۔ کرنل صاحب کا مہمان ابھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں اس کے جانے تک وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر بعد میں نے ابرار صاحب کو جانے کے لیے کمرے سے نکلتے دیکھا تو میں بوتلیں اور گلاس اٹھانے کے لیے اندر گیا۔ وہسکی کی بوتل اور گلاسوں کے علاوہ سوڈے کی تین بوتلیں تھیں۔ دو خالی اور تیسری میں کچھ سوڈا بچا ہوا تھا۔ میں جب یہ بوتل ٹرے میں رکھنے لگا تو کرنل صاحب نے کہا کہ یہ سوڈا نالی میں انڈیل دینا، نوکر پی لیتے ہیں، اچھا نہیں لگتا۔ میں نے اچھا حضور کہہ کر

ٹرے اٹھالی اور پینٹری میں گیا۔ مجھے کچھ شک ہونے لگا کہ اس سوڈے میں کوئی خاص بات ہے۔ شک کی ایک وجہ یہ تھی کہ کرنل صاحب مجھے بلانے کی بجائے خود بوتل لینے چلے گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ اسے کھول کر دیکھ رہے تھے پھر ہلا رہے تھے اور انہوں نے مٹھی میں ایک کاغذ مروڑ کر مجھ سے چھپا لیا تھا۔ تیسری وجہ یہ کہ کرنل صاحب نے مجھے کہا تھا کہ بچا ہوا سوڈا نالی میں پھینک دینا اور شک کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کرنل صاحب ابرار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ کرنل صاحب کا نہیں بیگم صاحب کا دوست تھا۔"

یہاں اس بوڑھے نوکر نے تین واقعات سنا کر ثابت کیا کہ کرنل صاحب کو بیگم اور ابرار کی دوستی پسند نہیں تھی۔ اس نے کہا ـــ "میں بالکل نہیں جانتا کہ اس رات ابرار صاحب کرنل صاحب کے پاس کیوں بیٹھے ہوئے تھے اور بیگم صاحب ان میں کیوں نہیں بیٹھی تھیں۔ مجھے شک یہ ہے کہ کرنل صاحب نے ابرار صاحب کو اپنی دوستی کا دھوکا دیا تھا اور وہ انہیں زہر پلانا چاہتے تھے۔ کرنل صاحب ظالم طبع انسان تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے بیگم صاحب کے ساتھ ہمدردی تھی . . . .

"میں نے بچا ہوا سوڈا کہیں پھینکا نہیں۔ میں بوتل اپنے ساتھ لے گیا۔ باورچی خانے میں ایک بلی آیا کرتی تھی اور برآمدے میں سو جایا کرتی تھی۔ میں نے باورچی خانے سے ایک پکے ہوئے سالن کی بوٹی لی اور اس پر تھوڑا سا سوڈا ڈال کر بلی کے آگے پھینک دی۔ بلی نے بوٹی کھالی۔ دوسرے دن بلی کو دیکھا۔ وہ بہت بے چین تھی۔ اور زور زور سے میاؤں۔ میاؤں کرتی تھی۔ سارا دن اور ساری رات وہ کسی تکلیف سے شور مچاتی رہی۔ اگلے روز اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ اٹھتی اور گر تی

تھی۔ پھر وہ مرگئی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اس سوڈے میں کرنل صاحب نے زہر ملا کر ابرار صاحب کو پلا دیا ہے . . . .

"بلی تو دو روز بعد مری۔ صبح ہی صبح کرنل صاحب سیڑھیوں سے گر کر مر گئے۔ گھر میں فسوس کے لیے آنے والوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔ میں نے سوڈے کی بوتل چھپا کر رکھ دی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ بیگم صاحب کو بتا دوں کہ کرنل صاحب آپ کے دوست کو زہر دے کر مرے ہیں۔ پھر مجھے یہ خیال آجاتا خود ہی نہ پھنس جاؤں۔ بیگم صاحب یہ نہ شک کر بیٹھیں کہ شراب پلانے کا کام تو میں کرتا ہوں پھر کرنل صاحب نے سوڈا واٹر میں زہر کیسے ملایا؟ اس میں ضرور میری شرارت ہے۔ میں نے تین روز ابرار صاحب کو بھی نہ دیکھا۔ وہ ہمارے ہاں نہیں آئے۔ پھر بیگم صاحب نے مجھے ان کی موت کی خبر سنائی جس کی میں نے ان کے دفتر میں جا کر تصدیق کی۔ مجھے ان کے دفتر سے پتہ چلا کہ تین روز سے تکلیف میں رہے اور مر گئے۔ بلی بھی تیسرے روز مری تھی۔ مجھے ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ بیگم صاحب کو اصل حقیقت بتا دوں۔ ہم غریب لوگ ہیں حضور والا! بادشاہوں کے اچھے بُرے معاملات میں دخل دے کر انسان خوار ہی ہوتا ہے . . . .

"پھر آپ آگئے۔ میں تو بوتل پھینکنے والا تھا۔ جب آپ آئے اور تفتیش شروع ہوئی تو میں نے بوتل پھینکنے کا ارادہ بدل دیا۔ میں نے سوچا کہ تفتیش میں سوڈے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں پھر بھی آپ سے بات کرتے ڈرتا تھا کہ کہیں کیس اُلٹ کر مجھ پر ہی نہ آپڑے۔ مگر آپ نے جن سپاہیوں کو یہاں پہرے پر بٹھایا ہے انہوں نے ہمیں ڈرا ڈرا کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکال دی ہے۔ انہوں نے ہم سب کو نظر بندی میں رکھا

ہوا ہے۔ ان کی باتوں سے ڈر کر میں یہ راز آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔"

کانسٹیبلوں کو میں نے ہی کہا تھا کہ نوکروں کو ڈراتے اور دھمکاتے رہیں اور انہیں یہ تاثر دیں کہ وہ سب قتل کے جرم میں پکڑے جائیں گے۔ میرا یہ طریقہ کامیاب رہا۔

یہ تو بہت ہی قیمتی راز تھا۔ میں نے بوتل اپنے قبضے میں لے لی اور اس نوکر کو گواہوں میں شامل کر لیا ۔۔۔ میں کرنل کی بیگم کے سونے والے کمرے میں گیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں نے اس کی اور ابرار کی اکٹھی تصویر اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے پہلے تو تصویر کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا۔ حیرت نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ اس نے تصویر کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھایا اور اچانک وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اس نے تصویر آنکھوں پر رکھ لی اور بچوں کی طرح بلبلانے لگی۔ اس کے رونے میں درد اور ہار تھی۔ میں کمرے میں ٹہلتا رہا۔

وہ ذرا سنبھلی تو میں نے کہا۔ "کرنل صاحب ابرار کو زہر دے کر مرے ہیں۔"

"کیا کہا آپ نے؟" اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔

"کرنل صاحب قتل ہونے سے پہلے اپنے قاتل کو قتل کر چکے تھے۔" میں نے الفاظ الگ الگ کر کے کہا ۔۔۔ "دونوں مقتول قاتل تھے۔ ایک مقتول فوراً مر گیا، دوسرا دو روز بعد مرا ۔۔۔ اب محترمہ! اپنے آپ کو مزید اذیت میں نہ ڈالیے۔ مجھے یہ بتا دیجئے کہ کرنل صاحب کو سیڑھیوں سے گرانے کا بندوبست کس نے کیا تھا اور جب وہ گرے تو ان کی کنپٹی پر ڈنڈا کس نے مارا تھا؟"

"میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔" اس نے کہا ۔۔۔ "کرنل صاحب پھسل کر گرے تھے۔"

"سنیئے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کرنل صاحب کس طرح گرے یا انہیں کس طرح گرایا

گیا تھا۔" میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کتاب کا وہ صفحہ کھولا جس کا کونہ موڑ کر کیا ہوا تھا۔ میں نے وہ پیراگراف پڑھ کر اسے سنایا جس کے حاشیے میں پنسل کی تھی۔ پیراگراف کے بالکل صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہیں رہے۔ بہر حال کچھ اس طرح تھے

"قتل کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ اندرونی سیڑھیوں کی سب سے اوپر والی ایک سیڑھی پر صابن بغیر بھگوئے مل دیا گیا۔ صابن کے باریک باریک ٹکڑے سیڑھیوں پر چپک گئے۔ صرف غور سے دیکھنے سے ہی نظر آتے تھے۔ ایک آدمی سیڑھیوں کے نیچے چھپا کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں شاہ بلوط کی لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ مقتول سلیپنگ روم سے نکل کر نیچے آنے لگا۔ اوپر کی سیڑھی سے اس کا پاؤں پھسلا۔ وہاں صابن ملا ہوا تھا۔ اس نے اگلی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر سنبھلنے کی کوشش کی۔ وہاں بھی صابن ملا ہوا تھا۔ وہ گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا۔ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ اس کی کنپٹی پر ڈنڈا پڑا۔ یہ ضرب مہلک ثابت ہوئی اور وہ مر گیا۔ گھر کے نوکروں نے اسے آکر اٹھایا۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ مقتول سیڑھیوں سے گر کر مرا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی لاش کو دیکھ کر یہی رائے دی کہ سیڑھیوں سے گر کر مرا ہے لیکن ....."

بوڑھے خاوند اور نوجوان بیوی کی کہانی

یہ جرم و جاسوسی کی ایک بڑی لمبی کہانی کا صرف ایک پیراگراف ہے۔ اس میں قاتل پکڑے گئے تھے۔ ایک مقتول کی بیوی تھی۔ دوسرا اس کا آشنا لیکن عدم

ثبوت کی بنا پر برنی ہو گئے۔ میں نے بیگم سے کہا ۔۔۔ "آپ نے اس کہانی سے اپنے آپ کو یقین دلا لیا تھا کہ قتل کے اس طریقہ کار سے آپ پکڑی نہیں جا سکیں گی لیکن آپ نے یہ نہ سوچا کہ یہ افسانہ ہے۔ اب یہ افسانہ آپ کی حقیقت کو ثابت کرے گا۔ سیڑھیوں سے صابن دھونے والی ملازمہ میرے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔ کرنل صاحب کے جو سلیپر میں نے قبضے میں لیے تھے ان کے ساتھ صابن کے نشان موجود ہیں۔ میرے پاس یہ گواہی دینے والی ایک عورت موجود ہے جو ثابت کرے گی کہ ابرار علی الصبح گھر سے نکلا اور دو اڑھائی گھنٹوں بعد گھر گیا تھا۔ یہ عورت ابرار کی بیوہ ہے۔ ابرار سیڑھیوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ وہ کرنل صاحب کی کنپٹی پر ڈنڈا مار کر یہاں سے غائب ہو گیا تھا۔"

اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا اور بہت دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔۔۔ "میرا جرم ثابت ہو جائے تو مجھے کتنی سزا ملے گی؟"

"اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں تو آپ کی کچھ مدد کر سکوں گا۔" میں نے اسے کہا۔۔۔ "آپ کو اپنے جرم کا اقبال کرنا ہو گا۔ ثبوت اور شہادت کی ضروری کڑیاں ملاتی جاؤں گی۔ آپ مجھے اپنے جرم کی کہانی سنائیں گی۔ تحریری اقبال جرم مجسٹریٹ کے سامنے ہو گا۔ وہاں آپ آزاد ہوں گی۔ آپ مجسٹریٹ کے سامنے جو چاہیں بیان دے دیں۔ مگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اگر آپ نے مجسٹریٹ کے سامنے گڑبڑ کی تو بھی بچ نہیں سکیں گی۔ آپ کو اب عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا ہی ہے۔"

اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ مجھے جھٹلا سکتی یا فرار کی کوئی صورت اختیار کر سکتی۔ اس نے لمبی آہ بھری اور غم میں ڈوبی ہوئی اور شکست سے کچلی ہوئی آواز میں کہنے

لگی — "میرے ماں باپ کو تو آپ اس جرم میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ ابھی ایسا قانون نہیں بنا جو والدین کو سزا دے سکے جو اپنی نوجوان بیٹیوں کو بوڑھے دولت مندوں سے بیاہ دیتے ہیں۔ اگر میرے ماں باپ یہ جرم نہ کرتے تو آج سوسائٹی میں یہ دو جرم نہ ہوتے جن کی تفتیش آپ کر رہے ہیں۔ ایک آدمی زہر سے مار دیا گیا اور دوسرے کو سیڑھیوں سے گرا کر ختم کر دیا گیا۔ میرے ساتھ جرم میں جو شریک تھا وہ زہر سے مر چکا ہے۔ اب سب کی سزا بھگتنے کے لیے میں اکیلی رہ گئی ہوں۔"

اس کی آواز میں قہر اور نفرت آگئی۔ دانت پیس کر بولی — "کہاں ہیں میرے ماں باپ؟ — کرنل کے مرنے پر وہ یہاں آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں انہوں نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا کہ یہ کوٹھی نہ چھوڑنا، یہیں رہنا ورنہ کرنل کے بھائی اور اس کی پہلی بیوی مالک بننے کی کوشش کریں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ اب آپ لوگ بھی اس کوٹھی میں نہیں آئیں گے۔ کوٹھی اور انشورنس میرے نام ہے۔ کرنل سے آپ نے میرے جسم کی قیمت وصول کر لی تھی۔ اب میں اپنی جوانی اور ان خوابوں کی قیمت وصول کروں گی جو آپ نے تباہ کیے ہیں — میں نے ماں باپ کے ساتھ ایسا بے ہودہ سلوک کیا کہ وہ چلے گئے۔ مجھے دراصل ابرار کا سہارا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی کر لے گا۔"

"ابرار کو آپ کس طرح جانتی تھیں؟"

اس نے آہ بھری اور کہا۔ "میں نے تو بہت سے آدمیوں کو جاننے کی کوشش کی تھی مگر میری پسند کا آدمی صرف ابرار تھا۔ میں آپ کو شادی کے بعد کی ساری باتیں سنا دیتی ہوں۔ شاید آپ کے دل میں کچھ رحم پیدا ہو جائے۔"

"میرے دل میں رحم پیدا ہو چکا ہے" میرے منہ سے اپنے آپ ہی یہ الفاظ نکل گئے — "میں آپ کی مدد کروں گا" میں پولیس انسپکٹر تھا لیکن میرے اندر ایک انسان جاگ اٹھا۔

اسے کچھ حوصلہ ملا۔ اس نے کہا — "یہ تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ بائیس سال کی لڑکی کا خاوند اس سے تیس سال بڑا ہو۔ شراب پی پی کر اس نے اپنا جسم کھوکھلا کر لیا ہو تو اس نوجوان لڑکی کا کیا حشر ہوتا ہو گا۔ کرنل نے مجھ پر یہ کرم کیا کہ مجھے گھر میں قید نہیں کیا بلکہ بڑے فخر سے مجھے پارٹیوں میں لے جانے لگا جہاں انگریز اور دیسی افسر آتے تھے۔ ان پارٹیوں میں شراب چلتی تھی۔ ڈانس ہوتے تھے۔ مجھے بھی ڈانس کی دعوت دی جاتی تھی مگر مجھے انگریزی ڈانس آتا نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے ایک انگریز فوجی افسر اپنے سینے سے لگا کر آرکسٹرا کی دھن کے ساتھ ہال میں گھماتا۔ وہ ہٹتا تو کوئی اور سینے سے لگا لیتا اور میں بالکل آزاد ہو گئی۔ میں نے اپنی عمر کے فوجی افسروں کے ساتھ دوستی پیدا کر لی اور کبھی ایک کے ساتھ کسی بڑے ہوٹل میں چلی جاتی کبھی کسی دوسرے کے ساتھ۔ کرنل صاحب بہت خوش تھے کہ ان کی بیوی نوجوان ہے، خوبصورت اور سوشل ہے . . .

"مختصر یہ کہ کرنل کے بوڑھے جسم سے مجھے نفرت ہو گئی اور میں اپنی تسکین کے لیے بدکار ہو گئی لیکن میں جن حالات میں بدکار ہوئی ان کی شدت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ان میں گھرا ہوا ہو۔ ابرار کا اپنا ٹھیکیداری کا کاروبار تھا۔ کرنل فوج کے اس محکمے کا انچارج تھا جہاں سے ٹھیکے دیے جاتے تھے۔ ابرار اور کرنل کی ملاقات کسی ٹھیکے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ کرنل رشوت لیتا تھا۔ اس نے ابرار کو گھر بلایا۔ یہیں

دین گھر میں بنتا تھا۔ میں نے پہلی بار ابرار کو دیکھا تو یہ آدمی میرے دل میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا ٹیلیفون نمبر نوٹ کر لیا۔ پھر ہماری ملاقاتیں شروع ہو گئیں . . . .

" [illegible] دل سے بہت ہی مختلف تھا۔ اسے میرے جسم سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرے جذبات کا اسے بہت [illegible] خیال رہتا تھا۔ وہ گھر جب بھی میرے پاس آیا کرتا تھا۔ کرنل کو میری اس سے ملاقاتیں پسند نہیں تھیں۔ کہا کرتا تھا کہ یہ معمولی سا ٹھیکیدار ہے۔ دراصل اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں ابرار میں زیادہ دلچسپی لیتی ہوں۔ وہ شاید اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میں جن افسروں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں وہ مجھے بہن سمجھتے ہیں اور ایک ابرار ہی ہے جو بدمعاش ہے . . . .

"ایک روز ابرار کے مسئلے پر ہمارا جھگڑا بھی ہو گیا۔ میں نے کرنل کو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ابرار یہاں آئے گا اور ضرور آئے گا۔ کرنل کے دل میں یہ بات اٹک گئی۔ میں کبھی کبھی شام کو ابرار کے دفتر چلی جاتی اور اسے باہر لے جاتی اور رات دیر تک اس کے ساتھ رہتی۔ ایک شام کرنل نے میرا پیچھا کیا اور مجھے ابرار کے ساتھ کار میں دیکھ لیا۔ میں نے اس کی کار اپنی کار کے قریب سے گزرتے دیکھی تھی۔ میں رات کو گھر آئی تو پھر اس کے ساتھ تُو تُو میں میں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے ابرار سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔"

"کیا آپ کو معلوم تھا کہ ابرار شادی شدہ ہے؟"

"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔ میرا معاملہ ٹیڑھا تھا۔ کرنل مجھے طلاق دینے پر کبھی راضی ہونے والا نہیں تھا۔ میں اور ابرار ایک دوسرے میں اس قدر گھل مل گئے تھے کہ جذبات نے ہمیں اندھا کر دیا تھا۔ ہم نے کرنل کو راستے

سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور سوچنے لگے کہ اسے کس طرح ختم کیا جائے۔ میں جرم و جاسوسی کی کہانیاں پڑھنے کی عادی تھی۔ میں ان کہانیوں سے قتل کے طریقے معلوم کرنے لگی۔ ذرا اس پر غور کریں کہ میں جرائم پیشہ گھرانے میں تو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کسی اچھے مقصد کے لیے تعلیم حاصل کی تھی۔ میں کسی باعزت گھرانے کی بہو بننا چاہتی تھی۔ کبھی کوئی گندی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ مگر مجھے ایسے عذاب میں ڈال دیا گیا کہ اپنی تسکین کے لیے ایسی کہانیوں کی عادی ہو گئی جن میں جنسی غلاظت اور جرم ہوتا تھا۔ میں اس نفسیاتی عذاب سے اور ان کہانیوں کے اثر سے اپنے آپ میں نہ رہی۔۔۔

”میں نے یہ کہانی پڑھی جس کا آپ نے ابھی ابھی حوالہ دیا ہے۔ مجھے یہ طریقہ زیادہ پسند آیا۔ اگر آپ نے یہ کہانی ساری پڑھی ہو تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس میں بھی ایک بیوی اپنے خاوند کو ایسے طریقے سے قتل کرنا چاہتی ہے کہ قتل کا شبہ نہ ہو۔ اس کا دوست اسے یہ طریقہ بتاتا ہے جس کے مطابق بیوی معمول سے پہلے جاگ اٹھی۔ اس کا خاوند ابھی سویا ہوا تھا۔ بیوی نے سنگِ مرمر کے بنے ہوئے زینے کی اوپر والی سیڑھی پر صابن رگڑ دیا۔ صابن کے چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑے سیڑھیوں کے ساتھ چپک گئے۔ بیوی نے اپنے دوست کو سیڑھیوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا ڈنڈا تھا۔ بیوی نے خاوند کو جگایا اور نیچے چلنے کو کہا۔ خاوند زینے سے اترنے لگا تو صابن سے اس کا پاؤں پھسلا۔ اس نے دوسرا پاؤں اگلی سیڑھی پر رکھا۔ وہاں بھی صابن تھا۔ وہ پھسلا اور لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا۔ وہ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ اس کی کنپٹی پر ڈنڈا پڑا اور وہ ختم ہو گیا۔ ڈنڈا مارنے والا غائب ہو گیا۔ بیوی نے شور مچایا۔ نوکر بھاگے آئے۔ بیوی نے کہا کہ یہ سیڑھیوں سے گرا ہے۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے بھی

یہی رائے دی کہ سیڑھیوں سے گرنے سے کوئی چوٹ مہلک ثابت ہوئی ہے . . .

"میرے نادان دماغ نے اسی طریقے کو بہتر سمجھا۔ آپ یہ تو سمجھ چکے ہوں گے کہ میرا دماغ کن چکروں میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے ابرار کو یہ کہانی پڑھائی تو اس نے کہا کہ ڈنڈا مارنے کا کام وہ کرے گا۔ ہم نے ڈرامہ طے کر لیا۔ آخری رات ابرار ہمارے ہاں آیا۔ کرنل گھر پر تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس نے ابرار کا استقبال دوستانہ طریقے سے کیا بلکہ بڑی ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ گپ شپ چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کرنل اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور مجھے کہہ گیا کہ میں نے ابرار صاحب کے لیے ایک ٹھیکہ روکا ہوا ہے۔ تم اوپر چلی جاؤ، میں ان سے بات کر لوں۔ اس نے ہنس کر کہا ــــ "وسکی کے پیگ پر بات اچھی طرح ہو سکتی ہے" ــــ میں اوپر چلی گئی۔ ابرار دراصل صبح کا پروگرام طے کرنے آیا تھا۔ وہ تو ہم نے ابرار کے دفتر میں بھی طے کر لیا تھا۔ میں سمجھی کہ کرنل واقعی کسی ٹھیکے کی بات کرے گا ــــ مجھے معلوم نہیں کہ اندر کیا ہوا۔"

"وہ آپ کو میں بتا دیتا ہوں۔" میں نے اسے اس کے نوکر کا بیان سنا دیا کہ کس طرح کرنل نے ابرار کو سوڈا واٹر میں زہر پلا دیا۔ میں نے اسے بوتل دکھائی، جس میں کچھ سوڈا بچا ہوا تھا۔ یہ بوتل مجھے کیمیکل ایگزامینر کو بھیجنی تھی۔ یہ ابھی میرے پاس تھی۔

وہ بہت دیر اسی بوتل کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اتنی دلکش آنکھیں میں نے کم ہی کبھی دیکھی ہوں گی۔ یہ لڑکی میرے دل میں اترتی جا رہی تھی، جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ جوان اور بہت خوبصورت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ایک مسلمان گھرانے کی شریف لڑکی ہوا کرتی تھی۔ ایسی ہی، ایک ملزم میری بھی تھی۔

کرنل کی بیوہ جب مجھے اپنا بیان دے رہی تھی تو کئی بار مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ میری بیٹی ہے۔ میں نے ایک بار سوچا کہ ماں باپ کے گناہ کی سزا اس لڑکی کو مل رہی ہے۔

اس کی قسمت میں اب صرف جیل نہیں لکھی تھی بلکہ جیل سے باہر ساری عمر کی رسوائی لکھی تھی۔ اسے اب ذلیل و خوار ہونا تھا۔ میں اس کی زیادہ سے زیادہ یہ مدد کر سکتا تھا کہ استغاثہ میں کہیں کمزوری رکھ دیتا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا وکیل اسے بری کرا لیتا۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ یہ بری ہو گئی تو بھی مہذب طوائف بنے گی اور چند سالوں کی جیل کاٹ کر نکلی تو بھی لوگ اسے لے اڑیں گے۔ اسے عمر قید نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ مجھے کچھ اس قسم کا خیال بھی آیا کہ اسے کہوں کہ یہ بوتل جو میں نے تمہیں دکھائی ہے اس میں زہر ہے۔ یہ پی لو اور ذلت کی زندگی سے نجات حاصل کر لو۔

میں اسے بوتل دکھا رہا تھا اور وہ اسے شفاف آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے بڑی آہستہ سے کہا ــــ "ابرار کو اس زہر سے مارا گیا تھا؟"

"جی۔ اس زہر سے"۔ میں نے کچھ سوچا اور کہا ــــ "یہ زہر انسان کو تیسرے دن مارتا ہے لیکن کئی دن سوڈے اور پانی میں پڑے رہنے سے اس قدر گل سڑ گیا ہے کہ زبان پر ایک قطرہ پڑ جائے تو انسان ختم ہو جائے۔ چلیئے۔ آپ اپنی بات پوری کریں"۔

وہی سیڑھیاں، وہی زہر

"ابرار جب بہت دیر بعد کرنل کے کمرے سے نکلا تو میں اس کے انتظار میں

چھپی ہوئی تھی۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے صرف اتنا کہا — "صبح وقت پر آجانا" — میں دوڑ کر سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد کرنل آگیا۔ وہ بہت خوش تھا اور ابرار کی تعریفیں کر رہا تھا۔ مجھے کیا علم تھا کہ یہ ناگ ڈنک مار آیا ہے۔ ہم سو گئے۔ آدھی رات کے بعد میں اٹھی۔ کرنل گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کی نیند اس لیے بھی گہری ہوتی تھی کہ وہ نیند کی گولیاں کھا کر سویا کرتا تھا۔ میں نے غسل خانے سے صابن کی ٹکیہ اٹھائی اور اوپر والی سیڑھی پر صابن کے باریک باریک ٹکڑے رکھ کر انہیں انگلیوں سے مسلا اور رگڑا۔ ٹکڑے پھیل کر فرش سے چپک گئے۔ دوسری سیڑھی پر بھی صابن مل دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کرنل ہمیشہ زینے کے جنگلے کی لکڑی پر ہاتھ رکھ کر چڑھا اور اترا کرتا تھا۔ میں نے اس طرف صابن ملا اور ہاتھ دھوئے پھر سو گئی . . . .

"میں وقت سے پہلے اٹھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ کوئی نوکر اندر تو نہیں آیا۔ وہ سب اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ابرار آچکا تھا۔ اسے اندر آتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ میں نے خانساماں سے جاکر کہا ناشتہ لگا دے۔ کرنل کو ڈاکٹر نے بیڈ ٹی پینے سے منع کر رکھا تھا۔ میں نے کرنل کو جگایا اور جب وہ نیچے آنے کے لئے تیار ہوگیا تو آگے چل پڑا۔ میں پیچھے تھی۔ وہ جونہی زینے پر پہنچا اور ایک پاؤں اگلی سیڑھی پر رکھنے لگا اس کا اوپر کا پاؤں پیچھے کو پھسل گیا۔ وہ پیٹ اور منہ کے بل سیڑھیوں پر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اسے شاید چوٹ شدید لگی تھی۔ نہایت آہستہ سے اس نے سر اٹھایا۔ زینے کے نیچے سے ابرار نکلا۔ اس نے کرنل کی کنپٹی پر بڑی زور سے ڈنڈا مارا۔ ابرار نے

انتظار نہ کیا۔ وہ ڈنڈا اٹھائے نکل گیا۔ پھر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔

"میں نے ایکٹنگ کی۔ چیختی چلاتی باہر کو دوڑی۔ نوکر دوڑے آئے۔ ساتھ والی کوٹھی سے بھی دو آدمی آ گئے۔ انہوں نے کرنل کو اٹھایا۔ میں نے ڈاکٹر ملہوترا کو ٹیلیفون کیا۔ وہ فوراً آ گیا۔ میں نے سب کو بتایا کہ کرنل صاحب سیڑھیوں سے گرے ہیں۔ کسی کو شک نہ ہوا۔ ڈاکٹر ملہوترا نے بھی تصدیق کر دی کہ موت گرنے کے صدمے سے واقع ہوئی ہے۔ کرنل صاحب کا دل کمزور تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کرنل کے رشتہ داروں کو کس طرح شک ہوا تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ انہوں نے پوسٹ مارٹم کی درخواست دے دی۔ کرنل کو قبر سے نکالا گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اس بدکار بڈھے نے مر کر بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ پھر آپ آ گئے۔"

اس نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! کیس ایسا مضبوط بنایئے کہ مجھے فوراً پھانسی دے دی جائے۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے جیل خانے کی سزا نہ دلوانا۔ میں پھانسی چڑھنا چاہتی ہوں اور بہت جلدی۔"

"آپ پر سب سے بڑا ظلم یہ ہوگا کہ آپ کو پھانسی نہیں دی جائے گی۔" میں نے کہا۔ میری جذباتی حالت بگڑ گئی تھی۔ پولیس انسپکٹروں کی جب تفتیش کامیاب ہو جاتی ہے اور ملزم اقبالِ جرم کر لیتے ہیں تو انہیں بہت خوشی ہوتی ہے خواہ کتنے ہی افراد پھانسی چڑھ جائیں۔ مگر مجھے ایسی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے دو بڑے ہی پیچیدہ اور اپنی سروس کے مشکل ترین کیسوں کی تفتیش کامیابی سے مکمل کر لی تھی۔ پھر بھی مجھے خوشی نہ ہوئی۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے، آپ بری ہو جائیں پھر آپ کیا کریں گی؟ ساری سوسائٹی کو پتہ چل چکا ہے کہ آپ نے اپنے

خاوند کو قتل کرایا ہے اور یہ تو آپ کی سوسائٹی کو علم ہے ہی کہ آپ کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ اب آپ کو کوئی اپنی بیوی نہیں بنائے گا۔ آپ کے جسم کے خریدار بہت ہوں گے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ آپ باقاعدہ عصمت فروشی کرنے لگیں گی اور آپ کو گرفتار کر کے روزانہ عدالت میں پیش کیا جایا کرے گا۔ اخباروں میں آپ کی تصویریں چھپیں گی۔ لوگ آپ کے نام سے جھوٹی اور ذلیل کہانیاں منسوب کریں گے۔ آپ کو بازاروں میں سے گزارا جایا کرے گا۔ پھر آپ کو جیل خانے میں بند کیا جائے گا۔ وہاں.....“

”خدا کے لیے انسپکٹر صاحب!“ وہ دوڑ کر میرے پاؤں میں گر پڑی اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہنے لگی —”مجھے گولی مار دو۔ مجھے آج ہی پھانسی چڑھا دو۔ میں مانتی ہوں کہ میں اپنے خاوند کی قاتل ہوں۔ مجھے آج ہی سزا دو اور گولی مار دو“

میں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اُف خدایا۔ اتنے حسین بال میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے جیسے میں ریشم پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور کہا —”ذرا دل کو سنبھالو۔ تھوڑا حوصلہ کرو“ — اسے پلنگ پر بٹھا کر میں ٹہلتے ٹہلتے کمرے سے نکل گیا۔ میں سیڑھیوں سے اترا اور ڈرائنگ روم میں گیا۔ کچھ دیر ڈرائنگ روم میں ٹہلتا رہا۔ اوپر کوئی چیز گرنے کی آواز آئی۔ میں آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم سے نکلا اور اس زینے تک پہنچا جہاں سے کرنل گرا تھا۔

اوپر لڑکی نمودار ہوئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑ رکھی تھی۔ کسی شدید تکلیف کی وجہ سے اس کے ہونٹ کھلے ہوئے اور دانت پس رہے تھے۔ اس نے آنکھیں سختی سے بند کر رکھی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس

نے زہر پی لیا ہے۔ میں زہر کی بوتل اس کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں زینے کے نیچے کھڑا رہا۔ زہر نے اس کے حلق کو شاید جلا ڈالا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہ چکرا کر گری اور گیارہ خوبصورت سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی میرے قدموں میں آپڑی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کی بند آنکھیں کھل گئی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اسے وہیں چھوڑ کر میں اوپر چلا گیا۔ اس کے کمرے میں سوڈا واٹر کی بوتل فرش پر پڑی تھی۔ اس نے سارا زہر پی لیا تھا۔

میں نیچے آیا تو میرا حوالدار اور دو کانسٹیبل لڑکی کی لاش کے قریب کھڑے تھے۔ حوالدار نے کہا — "صاحب، یہ تو مر گئی ہے۔"

"ہاں۔ اس نے زہر پی لیا ہے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ محکمانہ کارروائی تھی۔ میں ایک مہینہ معطل رہا۔ ملزم کے پاس زہر رکھ آنا بہت بڑا جرم تھا لیکن انگریز ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کوئی سزا نہ دی۔ یہ ایک انعام تھا جو اس نے مجھے اس صلے میں دیا تھا کہ میں نے دو انتہائی پیچیدہ کیسوں کی بالکل صحیح اور بہت تھوڑے وقت میں تفتیش کی تھی۔

میرے ساتھیوں اور دوستوں نے مجھے مرے ہوئے کیسوں کی کامیاب تفتیش کی مبارک باد دی۔ بعض نے کچھ سیکھنے کے لیے مجھ سے ایک ایک تفصیل سنی اور مجھ سے کچھ ڈھنگ سیکھے لیکن راز کی ایک بات تھی جو میں نے کسی کو نہیں بتائی۔ اب جب کہ وہ شہر انڈیا میں رہ گیا ہے۔ کیسوں کے فائل وہیں رہ گئے ہیں اور میں عمر کے آخری حصے میں آن پہنچا ہوں، میں یہ راز اپنے سینے سے نکال دینا

چاہتا ہوں۔ راز یہ ہے کہ میں نے لڑکی کو خود موقع دیا تھا کہ وہ زہر پی لے۔ میری یہ کہانی ذرا اوپر سے پھر پڑھیں۔ میں نے لڑکی سے کہا تھا کہ یہ زہر انسان کو تیسرے دن مارتا ہے مگر اب یہ گل سڑ کر اتنا تیز ہو گیا ہے کہ ایک قطرہ زبان پر پڑے تو انسان فوراً مر جائے گا۔

پھر میں نے لڑکی کو زہر پینے پر اس طرح اکسایا تھا کہ اس کے انجام کی اسے بڑی ہی بھیانک تصویر دکھائی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ تمہیں ہر روز عدالت میں بازاروں سے گزار کر پیش کیا جائے گا۔ اخباروں میں تمہاری تصویریں اور خبریں چھپیں گی اور اگر تم بری ہو گئیں تو تمہارا کوئی غمخوار نہ ہوگا۔ تمہاری سوسائٹی جانتی ہے کہ تمہارا چال چلن ٹھیک نہیں اور اگر تم جیل میں چلی گئیں تو تمہارا حشر اس سے بھی برا ہوگا۔

میں اس کی یہی مدد کر سکتا تھا کہ اسے ذلت کی آنے والی زندگی سے پہلے ہی اپنے آپ کو ختم کرنے کا موقع دوں۔ میں نے اسے یہ نہیں کہا کہ تم زہر پی لو اور انگریز، ہندو اور سکھ افسروں کی دست درازی سے پہلے ہی اپنے آپ کو ختم کر لو۔ میں نے اسے اپنے دل کی یہ بات بھی نہیں کہی کہ تم مسلمان کی بچی ہو، میں تمہیں شراب پیتے اور بدکاری کرتے نہیں دیکھ سکوں گا۔ میں نے اتنا ہی کیا کہ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال کر اور زہر کا اثر بتا کر اور بوتل دانستہ وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ کوئی پولیس آفیسر ایسی بھیانک غلطی نہیں کرتا کہ قتل کے ایسے ملزم کے پاس زہر چھوڑ جائے جس کا جرم ثابت ہو چکا ہو۔ اچھا ہوا کہ اس نے عقل سے کام لیا اور وہی زہر پی لیا جو اس کی بیگم کی دوست ابرار کو پلایا گیا تھا اور وہ اتنی سیڑھیوں سے گری جہاں سے اس کا شوہر گرا تھا۔